عقائد اہل سنت و جماعت کا مکمل بیان

بنام

العقیدۃ الطحاویۃ

تصنیف لطیف

امام ابو جعفر احمد بن محمد طحاوی مصری حنفی

رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۳۲۱ھ)

شرح

امام اکمل الدین محمد بن محمد بابرتی حنفی

رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۷۸۶ھ)

ترجمہ و تعلیق

محمد اسماعیل ازہری لکھنوی حفظہ اللہ

DAR AL-MALIK

عقائد اہل سنت وجماعت کا مکمل بیان

بنام

عقیدہ طحاویہ

تصنیف لطیف

امام ابو جعفر احمد بن محمد طحاوی مصری حنفی

رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۳۲۱ھ)

شرح

امام اکمل الدین محمد بن محمد بابرتی حنفی

رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۷۸۶ھ)

ترجمہ، تحقیق و تعلیق

محمد اسماعیل ازہری لکھنوی حفظہ اللہ

DAR AL-MALIK

الرقم المسلسل (۳۸)

نام کتاب	:	شرح عقیدہ طحاویہ
تصنیف	:	امام ابو جعفر احمد بن محمد طحاوی مصری حنفی رحمۃ اللہ علیہ
شرح	:	امام اکمل الدین محمد بن محمد بابرتی حنفی رحمۃ اللہ علیہ
ترجمہ و تحقیق	:	محمد اسماعیل ازہری لکھنوی حفظہ اللہ
پیشکش	:	مجلس ترجمۃ الکتب
کمپوزنگ وڈیزائننگ	:	دار الملک کمپیوٹرس
سن اشاعت	:	صفر المظفر ۱۴۴۵ھ / اگست ۲۰۲۳ء
بموقع	:	(۱۰۵)واں عرس رضوی
ایڈیشن	:	پہلا
صفحات	:	۲۵۶
ناشر	:	دار الملک، بریلی - انڈیا

DAR AL-MALIK

Published by:

DAR AI-MALIK

Publishers & distributers

Bareilly, UttarPradesh, (India)
Mobile No.: + 91 707 808 2017
E-mail: contact@daralmalik.com
Website: https://daralmalik.com

DM038-32

ISBN 978-81-956136-9-4

9 788195 613694

دعائیہ کلمات

شیخ الاسلام والمسلمین، رئیس المحققین، سند المفسرین

حضرت علامہ سید محمد مدنی اشرفی جیلانی جانشین حضور محدّث اعظم ہند کچھوچھہ مقدسہ

حامداو مصلیاو مسلّمًا

میرے بیٹے عزیز سعید مولانا سید حمزہ اشرف سلمہ نے موبائل پر "عقائدِ اہل سنت کا مکمل بیان" نامی کتاب دِکھائی، جو آٹھویں صدی ہجری کے مشہور حنفی محقق وفقیہ وامام محمد بن محمد بن محمود البابرتی کی "شرح عقیدہ طحاویہ" کا سلیس اردو ترجمہ ہے، عقیدہ طحاویہ علمِ عقائد کا اوّلین متن ہے، جس کی شرح وبسط میں بہت سے علما و محققین نے کتابیں لکھیں، علامہ بابرتی کی شرح عقیدہ طحاویہ انہیں مستند و معتمد شروح میں سے ایک ہے، یہ کتاب عربی زبان میں ہے، جسے اردو داں طبقہ کے لیے اردو قالب میں ڈھالا گیا ہے، جو انتہائی مفید اور نیک کوشش و سعی ہے۔

فقیر اشرفی نے جستہ جستہ کتاب کے کچھ اقتباسات کو پڑھوا کر سُنا، جس سے اندازہ ہوا کہ عربی عبارتوں کو اردو قالب میں ڈھالنے میں ترجمہ نگاری کے اصولوں کی بھرپور رعایت کی گئی ہے۔

اس کے مترجم عزیز القدر مولانا اسماعیل ازہری لکھنوی، میرے بیٹے عزیزم مولانا

سید حمزہ اشرف سلمہ کے زمانہ طالب علمی کے ساتھیوں میں سے ہیں، جو لکھنے پڑھنے اور تحقیق و جستجو کا ذوق رکھتے ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ آئندہ بھی یہ سلسلہ علمی جاری رکھیں گے۔

دعا ہے کہ مولی تبارک وتعالی مولانا موصوف کی اس کاوش کو قبول فرمائے، اور اس کتاب کو مقبولیت انام سے نوازے، اور یوں ہی مزید قلمی و تحریری خدمات دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین بجاہ اشرف المرسلین ﷺ۔

فقط والسلام علی من اتّبع الهدی

دعا گو

فقیر اشرفی و گدائے جیلانی

ابوالحمزہ سید محمد مدنی اشرفی جیلانی غفرلہ

سجادہ نشین مخدوم ملت حضور محدث اعظم ہند - قدس سرہ - کچھوچھہ مقدسہ

شرفِ انتساب

امامِ اہلِ سنت **امام احمد رضا** فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام، جنہوں نے عقائد اہلِ سنت پر اس وقت پہرا دیا جس وقت طاغوتی بدلیاں نمودِ ایمان پر چھا جانا چاہتی تھیں، جس وقت حزب الشیطان کے سپاہی نورِ ایمان کو بجھانے کی تدبیریں کررہے تھے، جس وقت شیخ نجد عوامِ اہلِ سنت کو قال اللہ وقال الرسول کا شہد چٹا کر درپردہ بدعقیدگی کا زہر پلا رہے تھے!!

و

استاذ محترم، شیخ مکرم حضرت مولانا **کمال احمد علیمی** صاحب حفظہ اللہ کے نام، جن کی درسگاہ میں علم کلام کا پہلا درس پڑھا، جن کی بارگاہ سے پہلی بار معلوم چلا کہ عقیدہ کس چیز کا نام ہے!!

و

استاذ عالی وقار، مرشدی ومربی، میرا سب کچھ، میری دنیا میری عقبی--- شیخ معظم **شیخ احمد محمود شریف** صاحب قبلہ –أطال اللہ بقائه– کے نام، جنہوں نے مجھ حقیر پر باپ کی محبت بھی لٹائی، استاذ کی شفقت بھی نچھاور کی، راہِ علم کے پیچیدہ مقامات سے بھی روشناس کرایا اور عقیدہ واصول تو خوب خوب پلایا!!

مترجم

عرضِ ناشر

بسم الله الرحمن الرحيم، الحمد لله المَلِك الحكيم، والصَّلاة والسَّلام على صاحب الخلق العظيم، وعلى آله وصحبه السَّالكين الطريق المستقيم.

اترتے چاند ڈھلتی چاندنی جو ہو سکے کر لے * اندھیرا پاکھ آتا ہے یہ دو دن کی اجالی ہے

تحریر و قلم کی حکمرانی ہر دور میں مسلّم رہی ہے، جیسے جیسے مسائل جنم لیتے رہے ہیں ویسے ویسے وسائل کا اضافہ بھی ہوتا رہا ہے، بڑھتے ہوئے مسائل نے انسان کے ذہن کو اس جانب مائل کر دیا، پھر رفتہ رفتہ تدوین و تصنیف کی ابتدا ہوئی اور اب تک کروڑہا کتب معرضِ وجود میں آگئیں، تاریخ شاہد ہے کہ تدوینِ علوم وفنون میں مسلمانوں کا پلہ ہمیشہ بھاری رہا ہے، بلکہ ماضی قریب میں بھی ہمارے ہزاروں عُلماو مشائخ ایسے گزرے ہیں، جن کی تصانیف معیارِ حق قرار پاتی ہیں، اور ان کے مقدس ہاتھوں سے فقہِ اسلامی کا ذخیرہ، احادیثِ نبوی کا انمول خزانہ، اور عقائد وکلام وغیرہ کا قیمتی سرمایا تحریری شکل میں ہم تک پہنچا ہے۔

یہ ایک نا قابل تردید حقیقت ہے کہ افکار و نظریات کے ترسیل وابلاغ کے لیے سب سے مؤثر ذریعہ تحریر ہے، مگر دورِ جدید میں مغربی قومیں ہم پر سبقت لے جاتی نظر آرہی ہیں، آخر کیوں؟ کیا ہم میں اربابِ قلم و قرطاس کا فقدان ہو گیا ہے؟ نہیں ہر گز نہیں!

امامِ عشق ومحبت سیدی سرکار اعلی حضرت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "ان شاء اللہ العزیز زمانہ ان بندگانِ خدا سے خالی نہ ہو گا، جو مشکل کی تسہیل، مُعضل کی تحصیل، صعب کی تذلیل، مجمل کی تفصیل کے ماہر ہوں۔ بحر سے صدف، صدف سے گوہر، بذر سے درخت، درخت سے ثمر نکالنے پر باذن اللہ تعالی قادر ہوں"۔ ("فتاوی رضویہ"، جلد۸، صفحہ:۲۵۱، مطبوعہ: امام احمد رضا اکیڈمی، بریلی شریف)۔

لیکن بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ ہمارا المیہ یہ ہے کہ اربابِ علم ودانش،

اور تحریر و قلم سے وابستہ افراد، جو کسی دنیوی منفعت کی طمع کے بغیر اپنا خون جگر ملتِ بیضا کی آبیاری کے لیے پیش کر رہے ہیں، ان مخلص قلمکاروں کو حوصلہ افزائی کے دو بول نہیں ملتے ہیں، نہ جانے کتنے اربابِ قلم ہیں کہ جن کی بے لوث کاوشیں مُسوّدے کی شکل اختیار کر کے الماریوں کی زینت بنی ہوئی ہیں؛ کیوں کہ ان کے پاس اشاعت کے لیے سرمائے کا کوئی انتظام نہیں۔

بِفضله تعالی وبکرم حبيبه الأعلى اسی ضرورت کے پیشِ نظر شہر رضا بریلی شریف سے **دار الملک فاؤنڈیشن** نے منفرد انداز میں قدم اٹھایا ہے، اور یہ ادارہ مختلف اہداف و مقاصد کے ساتھ ۹/ رمضان المبارک ۱۴۳۸ھ/ مطابق ۵/ مئی ۲۰۱۷ء، بروز جمعہ مبارکہ، بریلی شریف میں متعارف ہوا۔

واضح رہے! **دار الملک** صرف ایک مکتبہ کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک مِشَن ہے، جس کی منصوبہ بندی امامِ اہل سنت کی تعلیمات کے مطابق ہوئی ہے، امتِ مسلمہ کے تئیں کی گئی اکابرین واسلاف کی محنت شاقہ کو جدید تقاضوں سے لیس کر کے عوام و خواص کے سامنے پیش کرنا اس ادارے کا اہم ترین مقصد ہے۔

ہمارے ادارے کے چند اہم منصوبات

(۱) بر صغیر کے ائمہ و مشائخ اور علماء ربانیین کے قلمی مخطوطات، اور قدیم مطبوعات پر تحقیق کر کے، جدید طرز طباعت کے مطابق عالم عرب میں ان کی نشر و اشاعت کرنا۔

(۲) اردو اور فارسی تراث اسلامی کا بالخصوص عربی اور انگریزی زبان میں، اور بالعموم دیگر عالمی زبانوں میں ترجمہ کرنا، نیز تراث عربی کو اردو جامہ پہنانا۔

(۳) بر صغیر کے مدارس اسلامیہ میں رائج کتب "درس نظامی" پر مختلف جہات سے کام کرنا، مثلاً: حسب ضرورت شروحات تحریر کرنا، اور متون پر مفید تعلیقات و جدید حواشی لگانا، نیز مختلف علوم وفنون میں جدید تالیفات پیش کرنا، اور نئی طرز طباعت کے مطابق شائع کرنا۔

(۴) حسبِ ضرورت مصنفین کو نذرانے دے کر مفید کتب ورسائل تصنیف کروانا، اور ان کو عمدہ وخوش خط انداز میں چھاپ کر بقدر استطاعت تقسیم کرنا۔

(۵) مسلمانوں کے عقائد واعمال کے تحفظ، نیز احقاقِ حق وابطالِ باطل کے لیے دورِ حاضر کے اجلہ علما کی تصنیفات وتالیفات کے ذریعہ خدمات حاصل کرنا۔

(٦) بر صغیر کے ائمہ کرام اور علماذوی الاحترام کا عالم عرب اور دنیا بھر میں صحیح تعارف پیش کرنا، اوران پر لگے الزامات کا جواب دیتے ہوئے، ان کی دینی خدمات کو اجاگر کرنا، نیز ہند اور عرب کے مابین علمی، فکری اور ثقافی روابط قائم کرنا۔

ادارے کے چند اہم شعبہ جات کا تذکرہ

دار الملک فاؤنڈیشن کے مختلف شعبہ جات ہیں، جن میں مختلف علوم و فنون کے ماہرین، و متخصصین اور باحثین موجود ہیں جو اپنی علمی و تحقیقی خدمات پیش کرنے میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔ فاؤنڈیشن کے چند اہم شعبہ جات ملاحظہ فرمائیں:

* **دائرة تحقيق وإحياء التراث الإسلامي:** یہ شعبہ تراثِ اسلامی کی تحقیق کے ساتھ خاص ہے، اس میں بالخصوص علماء ہند، اور بالعموم علماء عرب کے قلمی مخطوطات اور قدیم مطبوعات پر تحقیق و تخریج وغیرہ کا کام ہوتا ہے۔

* **مجمع الإمام أحمد رضا للبحوث والدراسات الإسلامية:** یہ شعبہ اس امام برحق کے نام سے موسوم ہے، جس نے اپنی پوری زندگی خدمتِ دین متین، اور مدح حبیب رب العالمین ﷺ میں وقف کردی۔ مذکورہ شعبہ میں عام طور سے اسلامی عقائد، اسلامی ثقافت، اور دیگر اہم موضوعات پر علمی و تحقیقی ابحاث تحریر کی جاتی ہیں، اور خاص طور سے امامِ اہل سنت سیدی سرکار اعلی حضرت رضی اللہ عنہ کی شخصیت، اور آپ کی تصنیفی کاوشوں پر مختلف جہات سے تحقیقی کام ہوتا ہے، ساتھ ہی ساتھ امام اہل سنت کی اردو اور فارسی تصنیفات کا عربی اور انگریزی زبان میں ترجمہ کرنا بھی اس شعبہ کے قیام کا اہم ہدف ہے۔

* مجلس ترجمة الكتب: مذکورہ شعبہ میں اردو اور فارسی کتب ورسائل کا عربی اور انگریزی زبان میں، اور اسی طرح عربی کتابوں کا اردو، ہندی اور انگریزی زبان میں ترجمہ ہوتا ہے، نیز حسبِ ضرورت دیگر عالمی زبانوں میں بھی ترجمہ کرنا اس کے ہدف میں شامل ہے۔

* شعبة إخراج الكتب المقررة في المدارس الدينية: مذکورہ شعبہ میں ہندوستانی مدارسِ اسلامیہ میں رائج "درسِ نظامی" کی کتابوں پر ضرورت کے مطابق مفید شروحات، اور جدید تعلیقات وحواشی لکھے جاتے ہیں، نیز درسیات سے متعلق مختلف علوم وفنون میں نئی تالیفات پیش کی جاتی ہیں۔

بحمد اللہ تعالی یہ ادارہ اس وقت مسلسل اپنی کوششوں میں لگا ہوا ہے، اور زمانے کے لحاظ سے جدید طرز پر اب تک کئی اہم کتابیں ہندوستان ومصر سے شائع کر چکا ہے۔

اللہ رب العزت کی بارگاہ میں دعا ہے کہ ہمارے ادارے کو خوب ترقی عطا فرمائے، اور اس کے منشورات کو مقبول خاص وعام فرمائے، اور خالص اپنی رضا کی خاطر کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے، ادارے کے تمام امور آسان فرمائے، اور اس کے اعضاء ومساعدین ومتوسلین کو صراط مستقیم پر چلائے، اور ثبات قدمی عطا فرمائے، اور خدمت دین متین کی خلوص وللّٰہیت کے ساتھ مزید توفیق عطا فرمائے، آمین يا رب العالمين بجاه النبي الأمين، عليه وعلى آله أفضل الصلاة وأكرم التسليم.

دار الملک فاؤنڈیشن

پیش لفظ

الحمدُ لله المَلِك الذي نوَّر قلوبَنا بمعرفة عقائد التَّوحيد، وجعلنا مِن أهل التَّقليد، والصَّلاةُ والسَّلامُ على رسول الله الفريد الوحيد، وعلى آله وأصحابه وذُرِّيّاته، ومَن تبعهم بإحسانٍ إلى يوم الوعيد.

أما بعد:

بلا شبہ کتابِ مستطاب **"عقیدہ طحاویہ"** حضرت امام ابو جعفر احمد بن محمد طحاوی مصری حنفی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی:۳۲۱ھ) کی مایہ ناز تصنیف ہے، جس میں عقائدِ اہل سنت وجماعت کا مکمل بیان ہے، اہل علم کے درمیان اس کتاب کی افادیت مُسلم ہے، اور مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ تقریبًا تمام مدارسِ اسلامیہ میں شاملِ نصاب ہے۔ اس کتاب کی ہر زبان میں بے شمار شروحات لکھی جاچکی ہیں، انہیں میں سے ایک نہایت ہی عمدہ اور اہم عربی شرح جو آٹھویں صدی ہجری کے جید عالم حضرت علامہ شیخ اکمل الدین محمد بن محمد بن محمود بابرتی حنفی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی:۷۸۶ھ) نے تالیف فرمائی ہے۔ اس عربی شرح کی افادیت و معنویت کو مد نظر رکھتے ہوئے حضرت مولانا محمد اسماعیل ازہری صاحب حفظہ اللہ نے اس کا اردو زبان میں نہایت ہی سلیس اور بامحاورہ ترجمہ کیا؛ تاکہ اردو داں طبقہ بھی اس سے مستفید ہوسکے۔

بحمدہ تعالی یہ اہم اور مفید شرح پہلی بار **"دار الملک فاؤنڈیشن"** (بریلی، الہند) سے دَورِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق بہت عمدہ اور جدید طرزِ طباعت سے آراستہ ہو

کر اس وقت آپ کے ہاتھوں کی زینت بنی ہوئی ہے۔

کتاب پر کام کی تفصیل:

اِس کتاب پر کام کے سلسلے میں اُس نسخہ پر اعتماد کیا گیا ہے، جو شیخ عبد السلام بن عبد الہادی شنّار حفظہ اللہ کی تحقیق و تعلیق کے ساتھ، دار البیروتی (اِستانبول، ترکی) سے (۱۴۳۰ھ/ ۲۰۰۹ء میں) شائع ہوا۔

اس کے علاوہ کتاب کی تحقیق و تخریج وغیرہ میں جو کوشش کی گئی ہے، اس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

- اوّلاً جدید قواعدِ کتابت کے لحاظ سے اس کی کمپوزنگ۔
- جدید طرز کے مطابق علاماتِ ترقیم اور پیرابندی کی رعایت۔
- متن عقیدہ طحاویہ کو خط کشیدہ کر کے جلی حروف میں نمایاں کر دیا گیا ہے۔
- آیاتِ قرآنیہ واحادیث مبارکہ کی تخریج[1]۔
- قرآنی آیات کو اِن قوسَین ﴿ ﴾ کے درمیان رکھا گیا ہے، نیز احادیث نبویہ، اور جو عبارات کہیں سے مقتبَس ہیں یا جن الفاظ کی تشریح کی گئی ہے، اور اسی طرح وہ عبارات جن کا اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے اُن سب کو اس علامت "---" کے درمیان رکھا گیا ہے۔
- حسبِ ضرورت مفید تعلیقات کا اہتمام کیا گیا ہے۔
- مفہوم کو واضح کرنے کے لیے بہت سی جگہوں پر عبارات کو بین القوسَین رکھا گیا ہے۔
- جن مقامات پر مترجم کی طرف سے الفاظ وعبارات کی زیادتی کی گئی ہے، اُنہیں اِن

---

(۱) احادیث کی تخریج میں عربی والا محقق نسخہ، جس سے ترجمہ ہوا ہے اسی کے حوالہ جات پر اکتفا کیا گیا ہے۔

قوسین[] میں رکھا گیا ہے۔

❖ سرخیوں کا خاص طور سے التزام کیا گیا ہے، اور اضافی سرخیوں کو اِن قوسین[] کے درمیان رکھا گیا ہے۔

❖ کتاب کے شروع میں کتاب، ماتِن اور شارح رحمۃ اللہ علیہما کا مختصر تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔

❖ پوری کتاب کو مندرجہ ذیل تین (۳) ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے:

- الہیات۔
- نبوات۔
- سمعیات۔

الحمد للہ اس کتاب کے ترجمہ پر بڑی عرق ریزی سے کام کیا گیا ہے، اور حتی المقدور اس کی تصحیح و تخریج بھی کی گئی ہے، اور اس بات کی بھی پوری کوشش کی گئی ہے کہ کوئی کمی اور خامی نہ رہ گئی ہو، اس کے باوجود بھی بتقاضاے بشری اگر کہیں کوئی غلطی رہ گئی ہو، تو اللہ تعالی معاف فرمائے۔ اور قارئین کرام سے بھی پر خلوص گزارش ہے کہ کوئی چیز قابلِ اصلاح نظر آئے تو ضرور مطلع فرمائیں؛ تاکہ اگلے ایڈیشن میں اس کی اصلاح کی جاسکے۔ إنَّ الله لا يضيع أجر المحسنين.

کلماتِ تشکر:

ہم مشکور و ممنون ہیں کتاب کے مترجم، ہمارے عزیز دوست محب گرامی حضرت مولانا محمد اسماعیل ازہری کے کہ انہوں نے ہماری خواہش کی تکمیل کرتے ہوئے اس مبارک کتاب کا اردو زبان میں آسان اور بامحاورہ ترجمہ کیا، اور گاہے بگاہے تعلیقات بھی

رقم کیں، اور ساتھ ہی ماتن وشارح کے حالات قلم بند کیے، نیز شروع کتاب میں علمِ کلام پر ایک شاندار مقدمہ بھی تحریر کیا، اللہ تعالی مترجم حفظہ اللہ کو اس کا بہترین صلہ عطا فرمائے۔

یوں ہی ہم شکر گزار ہیں **دار الملک** کی پوری ٹیم کے بھی، جنھوں نے کتاب کی تخریج، نظر ثانی، غلطیوں کی نشاندہی اور کمپوزنگ وغیرہ کے فرائض انجام دیے، بالخصوص حضرت مولانا محمد ثامر رضا مصباحی، ومولانا محمد ذیشان حنفی ازہری، اور مولانا فضیل احمد نوری ازہری حفظہم اللہ، اللہ تعالی اِن حضرات کو دارَین کی نعمتوں، عظمتوں اور سعادتوں سے سرفراز فرمائے۔ وجزاهم الله تعالى أحسن الجزاء، ووفّقهم لمزيد من الخدمات الدينية العلمية، ونسأله أن يجعل هذا العملَ خالصًا لوجهه الكريم، ننتفع به غدًا يوم الحساب، يوم لا ينفع مالٌ ولا بنون إلّا مَن أتى الله بقلب سليم، آمين يا ربِّ العالمين، بجاه النَّبي الكريم، عليه وعلى آله أفضل الصَّلاة وأكرم التسليم.

شیر از احمد نظامی ازہری

دار الملک فاؤنڈیشن، بریلی شریف

۸؍ صفر المظفر ۱۴۴۵ھ، مطابق ۲۵؍ اگست ۲۰۲۳ء، بروز جمعہ مبارکہ

***

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ ایک تعارف

نام و نسب:

محدث و فقیہ مصر، الحافظ الکبیر، امام ابو جعفر احمد بن محمد بن سلامہ بن سلمہ بن عبد الملک اَزدی حَجْری، مصری، طحاوی، حنفی۔

"اَزدی" یمن کے مشہور حجری قبائل میں سے "قبیلہ حجر الاَزد" کی طرف منسوب ہے، کیوں کہ آپ کی اصل اسی قبیلے سے جاکر ملتی ہے، اور "حجری" بھی اسی قبیلہ کی طرف منسوب ہے۔ "طحاوی" کی نسبت بالائی مصر کے ایک گاؤں "طحا" کی طرف ہے، چوں کہ آپ کا تعلق اسی گاؤں سے تھا اس لیے آپ کو طحاوی کہا جاتا ہے۔

ولادت:

ابن خلکان رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "وفیات الاعیان" میں ذکر فرمایا ہے کہ آپ کی سن پیدائش: ۲۳۸ھ ہے، جب کہ ابو سعید سمعانی رحمۃ اللہ علیہ نے ۲۲۹ھ ذکر فرمائی ہے اور یہی صحیح بھی ہے۔

آپ کا فقہی مذہب:

حضرت ابو اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "طبقات الفقہاء" میں ایک قصہ ذکر فرمایا ہے، جو آپ کے فقہی مذہب پر روشنی ڈالتا ہے: وہ لکھتے ہیں کہ امام ابو جعفر طحاوی رحمۃ اللہ علیہ ابتدا میں شافعی تھے اور اپنے ماموں امام مزنی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس - جو کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے خاص شاگردوں میں سے تھے - پڑھا کرتے تھے۔ ایک دن آپ کے ماموں نے آپ کو یہ طعنہ دیا کہ خدا کی قسم اب تک تم سے کچھ بھی نہیں ہو پایا ہے! اس پر آپ کو غصہ آیا اور پھر

آپ نے ان کی مجلسِ درس کو ترک کر کے امام ابن ابی عمران رحمۃ اللہ علیہ کے حلقہ درس کو اختیار کر لیا جو کہ اس وقت مصر میں ہی مقیم تھے اور اپنے وقت میں مذہبِ حنفی کے بڑے ائمہ میں شمار کیے جاتے تھے۔ اس کے بعد جب آپ نے عقیدے کی اپنی مشہور کتاب "مختصر الطحاوی" لکھی تو آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ابو ابراہیم یعنی امام مزنی پر رحم فرمائے! اگر وہ آج زندہ ہوتے تو انہیں اپنی قسم کا کفارہ دینا پڑتا۔

امام ابو سلیمان دمشقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جس سے میں نے سب سے پہلے حدیث لکھی وہ مزنی ہیں، ابتدا میں میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول اختیار کرتا تھا، پھر جب کچھ سالوں کے بعد احمد بن ابی عمران رحمۃ اللہ علیہ مصر کے قاضی بن کر آئے تو میں ان کی صحبت میں بیٹھنے لگا اور پھر انہیں کے قول پر عمل بھی کرنے لگا۔

حضرت ابو یعلی خلیلی رحمۃ اللہ علیہ "کتاب الارشاد" میں ذکر فرماتے ہیں کہ محمد بن احمد شروطی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے ایک بار امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ آپ نے اپنے ماموں کی مخالفت کر کے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب کیوں اختیار کیا!؟ تو انہوں نے فرمایا: کیوں کہ میں اپنے ماموں کو ہمیشہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں میں غور و فکر کرتے دیکھا کرتا تھا، اس وجہ سے میں انہیں کے مذہب کی طرف منتقل ہو گیا۔

آپ کے اساتذہ:

علم حدیث میں آپ کو بہت بلند مقام حاصل ہے، چنانچہ آپ نے عبد الغنی بن رفاعہ، ہارون بن سعید ایلی، یونس بن عبد الاعلی، بحر بن نصر خولانی، محمد بن عبد اللہ بن حکم، عیسی بن مثرود، ابراہیم بن مُنقذ، ربیع بن سلیمان مرادی، اپنے ماموں ابو ابراہیم مزنی، بکار بن قتیبہ، مقدام بن داود رُعینی رحمۃ اللہ علیہم جیسے جلیل القدر مشائخ سے احادیث سنیں۔

فقہ میں بھی آپ کا مقام بہت بلند ہے، علم فقہ آپ نے **قاضی احمد بن ابی عمران حنفی** رحمۃ اللہ علیہ کے پاس رہ کر پڑھا۔

پھر ٢٦٨ھ میں آپ شام منتقل ہوگئے اور وہاں پر **قاضی ابو خازم عبد الحمید بن عبد العزیز** رحمۃ اللہ علیہ سے بھی علم فقہ حاصل کیا۔

آپ کے تلامذہ:

آپ کے تلامذہ کی فہرست بڑی طویل ہے، جن میں یوسف بن قاسم میانجی، ابو القاسم طبرانی، محمد بن بکر مطروح، احمد بن قاسم خشاب، ابو بکر ابن المقری، احمد بن عبد الوارث زجاج، عبد العزیز بن محمد جوہری، ان کے علاوہ مصر و دمشق اور دوسرے ممالک کے تلامذہ بھی شامل ہیں، جنہوں نے آپ سے احادیث روایت کی ہیں۔

آپ کا علمی مقام:

ابو سعید بن یونس رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ ثقہ، ثَبت، فقیہ اور عقلِ عظیم کے مالک تھے، آپ کے بعد کوئی آپ جیسا نہیں آیا۔

ابو اسحق رحمۃ اللہ علیہ نے "طبقات الفقہاء" میں ذکر فرمایا ہے کہ مصر میں آپ پر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ کی علمی ریاست ختم ہوگئی۔

امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے "سیر اعلام النبلاء" میں لکھا ہے کہ جو بھی اس امام کی تالیفات کا مطالعہ کرے گا اسے ان کے علمی مقام و وسعت کا پتہ لگ جائے گا۔

امام قضاعی رحمۃ اللہ علیہ نے "کتاب الخطط" میں ذکر فرمایا ہے کہ آپ نے امام مزنی اور ان کے طبقے کے عموماً سبھی علما کی صحبت پائی اور علم شروط میں آپ کو بڑی مہارت حاصل تھی۔ علم العِلَل میں آپ کو جو بلند مقام حاصل تھا اس کی نظیر کسی بھی مذہب میں جلدی

نظر نہیں آتی، اس بات کا اندازہ آپ کی کتاب "شرح معانی الآثار" پڑھ کر بخوبی ہوتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ بالاتفاق اپنے وقت میں فقہ، حدیث، علما کے مابین اختلافی مسائل اور لغت و نحو کے امام تھے۔

آپ کی تصنیفات:

-احکام القرآن

-اختلاف العلماء

-شرح معانی الآثار

-بیان مشکل الآثار

-کتاب الشروط الکبیر والشروط الصغیر والشروط الاوسط

-کتاب فی التاریخ

-شرح الجامع الصغیر

-النوادر الفقہیہ

-مناقب ابی حنیفہ

-عقیدۃ اہل السنۃ والجماعۃ اور اسی متن کی شرح ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

آپ کی وفات:

بروز جمعرات، ذو القعدہ کے ابتدائی ایام میں ۳۲۱ھ کو سرزمین مصر میں آپ اپنے مالکِ حقیقی سے جاملے، اور وہیں پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے قریب قرافہ نامی جگہ پر آپ کی تدفین عمل میں آئی، اور وہاں پر آج بھی آپ کا مزار بہت مشہور ہے۔

امام بابرتی رحمۃ اللہ علیہ ایک تعارف

نام ونسب:

آپ کا پورا نام محمد بن محمود بن احمد الروی البابرتی، اکمل الدین بن شمس الدین بن جمال الدین حنفی ہے۔ ایک دوسرے قول کے مطابق آپ کا نام محمد بن محمد بن محمود ہے۔

"بابرتی" بغداد سے ساٹھ کلومیٹر دور شمالی سمت میں شہر دجیل کے اطرف میں ایک گاؤں واقع ہے جس کا نام "بابرت" ہے، بابرتی کی نسبت اسی گاؤں کی طرف ہے۔

ولادت اور پرورش وپرداخت:

آپ کی پیدائش سات سو کچھ ہجری میں ہوئی۔ آپ بچپن سے ہی حصول علم میں مشغول ہوگئے، اس مقصد کے لیے آپ نے حلب کا سفر بھی کیا، قاضی ناصر الدین بن العدیم نے آپ کو مدرسہ سادجیہ میں ٹھہرایا اور ایک مدت تک آپ اسی مدرسہ میں مقیم رہے۔

پھر جب چالیس سال کے بعد آپ مصر تشریف لائے تو وہاں پر آپ نے شمس الدین اصفہانی اور ابوحیان سے اکتسابِ فیض کیا اور ابن عبد الہادی اور دلاصی وغیرہ سے احادیث کی سماعت کی۔

اس کے بعد آپ کو امیر شیخون کا ساتھ مل گیا جس کو اس وقت مملوکی حکومت میں ایک بڑا مقام حاصل تھا چنانچہ امیر شیخون نے ان کو اپنی بارگاہ میں خصوصی مقام عطا کیا اور اپنی قائم کی ہوئی خانقاہ میں آپ کو بطور شیخ متعین کر دیا اور اس خانقاہ کے سارے امور آپ کے ذمے کر دیے، جس کے بعد آپ نے بڑی خوش اُسلوبی سے وہاں کے نظام کو

سنبھالا اور اس کی شہرت میں چار چاند لگا دیے۔

امیر شیخون کی بارگاہ میں آپ کو بڑی مقبولیت حاصل تھی، پھر ان کے بعد جو بھی آیا اس نے آپ کی بڑی تعظیم و تکریم کی، حتی کہ امیر ظاہر برقوق کی نگاہ میں بھی آپ کے لیے بہت عزت تھی، کہا جاتا ہے کہ جب وہ خانقاہ "شیخونیہ" کی کھڑکی کے پاس آتے تو سواری پر بیٹھے بیٹھے انہیں آواز دیتے اور باہر کھڑے ان کا انتظار کرتے رہتے پھر جب وہ باہر نکل کر آتے تو پہلے انہیں اپنے پیچھے سوار کر لیتے پھر آگے بڑھتے۔

آپ کے اوصاف:

آپ قوی النفس، عالی ہمت، پاک طینت، پاکیزہ سیرت اور بڑے فضل و کمال والے تھے۔ متعدد فنون پر آپ کو مہارت حاصل تھی، اور آپ نے بلا کی عقل پائی تھی۔ جو بھی آپ کے پاس آتا آپ اس سے خندہ پیشانی سے ملتے اور حسن اخلاق کا مظاہرہ فرماتے، اسی لیے کوئی شخص آپ کی بات نہیں ٹالتا تھا۔ ان تمام کمالات کے باوجود تواضع وانکساری کا دامن کبھی بھی آپ سے نہیں چھوٹا۔ بڑے مناصب پر بیٹھنے سے ہمیشہ گریز کرتے تھے، حتی کہ کئی بار آپ پر منصبِ قضا پیش کیا گیا، لیکن ہر بار آپ نے منع فرما دیا۔

بڑے بڑے اصحابِ منصب آپ کے دروازے پر ہمیشہ اس انتظار میں کھڑے رہتے تھے کہ ذرا دیر کے لیے انہیں آپ کی خدمت کا موقع مل جائے تو ان کی قسمت کا ستارہ بھی بامِ عروج پر نمودار ہو۔

آپ کا علم:

آپ کو فقہ، علمِ کلام، عربی زبان، اصول اور تفسیر پر کافی دَرْک حاصل تھی، ان تمام علوم میں آپ کی بڑی گراں قدر تصنیفات ہیں۔ جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:

آپ کی تصنیفات:

-مختصر ابن حاجب کی شرح "النقود والردود"

-شرح مشارق الانوار

-اصول بزدوی کی شرح "التقریر"

-ہدایہ کی شرح "العنایۃ"

-متن المنار کی شرح "الانوار"

-شرح الفیۃ ابن معطی

-شرح التلخیص فی المعانی والبیان

-آپ کی ایک عمدہ تفسیر بھی ہے

-شرح العقیدہ الطحاویہ، یہی وہ کتاب ہے، جس کی شرح کے ہم درپے ہیں۔

آپ کی وفات:

ستّر سے زائد برس گزار کر جمعہ کی رات، ماہِ رمضان المبارک ۷۸۶ھ میں سرزمین مصر میں آپ کا وصال پر ملال ہوا۔ خود بادشاہ وقت اور اس کے علاوہ دوسرے اصحابِ مناصب سے لے کر عوام و خواص سب آپ کے جنازے میں شریک ہوئے، بادشاہ نے آپ کو کاندھا دینا چاہا، لیکن کسی سبب سے ان کے ماتحتوں نے انہیں منع کر دیا۔

اور آپ کی تدفین اسی خانقاہ "شیخونیہ" کے اندرونی حصے میں عمل میں آئی، جہاں پر بیٹھ کر آپ نے قرآن وسنت کی خدمت کی تھی اور ان کا مزار آج بھی زیارت گاہِ خلائق بنا ہوا ہے۔ فقیر کو بھی استاذ محترم شیخ احمد شریف حفظہ اللہ کی معیت میں اس مزار اقدس کی خاک بوسی کا شرف حاصل ہوا ہے۔

مقدمہ علم کلام

علم کلام کی نشوونما:

ایسا نہیں ہے کہ علم کلام زمانہ رسالت میں موجود نہیں تھا، پھر بعد میں متکلمین نے اس کا ایجاد کیا۔ بلکہ ایجاد اور تدوین دونوں میں بڑا فرق ہے:

ایجاد یہ ہے کہ کسی چیز کا پہلے سے کوئی وجود نہیں تھا پھر آنے والا آیا اور اس نے اسے وجود بخشا۔

اور تدوین یہ ہے کہ کوئی چیز پہلے سے ہی موجود تھی، لیکن اس میں تنظیم وترتیب اور شرح وتفصیل کا فقدان تھا، دلائل وبراہین کی قلت تھی پھر آنے والا آیا اور اس نے اس میں تنظیم وترتیب کے ذریعہ اس کی نوک پلک سنواری، شرح وتفصیل کا اس پر ملمع چڑھایا، دلائل وبراہین کی زبان اسے عطا کر دی۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ علم کلام کا وجود نبی ﷺ کے زمانے میں بھی تھا، لیکن اس کی تدوین اس کے بعد آنے والے زمانے کی دین ہے۔

اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ اس علمِ کلام کے اصول کا وجود زمانہ رسالت میں بھی تھا، لیکن اس طرح سے نہیں جس طرح آج ہمارے سامنے موجود ہے، قرآن وحدیث میں جو نظر دوڑائے گا اس پر یہ بات مخفی نہیں رہ جائے گی کہ ان کا دامن علم کلام کے اصول سے پُر ہے۔ جیسا کہ دلیل وحدانیت کے بارے میں ارشاد باری تعالی ہے: ﴿لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا﴾ [انبیاء:۲۲] "اگر ان (زمین وآسمان) میں اللہ کے سوا کوئی معبود

ہوتا تو ان میں فساد برپا ہو جاتا"۔

اسی طرح آخرت میں رویت باری تعالی کے مسئلے میں ارشاد نبوی ﷺ ہے:

«فَإِنَّكُمْ سَتَرَوْنَ رَبَّكُمْ كَمَا تَرَوْنَ الْقَمَرَ لَيْلَةَ الْبَدْرِ، لَا تُضَامُونَ فِي رُؤْيَتِهِ»

"بیشک تم اپنے رب کو ایسے دیکھو گے جیسے چودھویں کے دن چاند کو دیکھتے ہو، تم اس کو دیکھنے میں ایک دوسرے پر ڈھے نہیں پڑ رہے ہو گے!" [ترمذی: ۲۵۵۴]۔

اس کے علاوہ اور بھی سیکڑوں آیات واحادیث ہیں، جو ہمارے دعوے کو ثابت کرتی ہیں، لیکن یہ مقام اس کا متحمل نہیں ہے۔

پھر صحابہ کرام کے زمانے میں بھی کچھ واقعات ایسے پیش آتے رہے جن کا براہ راست تعلق علم کلام سے تھا، جیسے معبد الجہنی جنہوں نے حضرت ابن عباس، ابن عمر، حسن بن علی اور معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہم جیسے جلیل القدر صحابہ سے احادیث بھی سنیں، لیکن "ابو یونس اسواری" یا پھر "سوسن" سے متاثر ہو گئے جو کہ عقیدۃً نصرانی تھے، اس کے بعد قدر کا انکار کر بیٹھے، پھر اسی سلسلے میں انہیں سولی بھی دے دی گئی۔ اس زمانے میں اسی سے ملتے جلتے وقتاً فوقتاً اور بھی واقعات پیش آتے رہے۔

پھر جب اسلام صحراے عرب سے نکل کر روم و یونان میں پہنچا، عرب کا عجم کے ساتھ اختلاط بڑھا، وہاں کے لوگ کچھ تو یونانی فلسفے سے متاثر تھے اور کچھ مسیحی فلسفے کا بھی ان پر جادو تھا، پھر یہی اثر دھیرے دھیرے عربوں میں بھی آنا شروع ہوا اور پھر نت نئے طریقوں سے اسلام پر اعتراضات کا دروازہ کھل گیا، انہوں نے یونانی فلسفے کا استعمال کر کے لوگوں کو اسلام سے دور کرنے کی کوششیں تیز کر دیں اور ادھر خود اسلام کے اندر ہی کئی کلامی آراء سامنے آگئیں جو عام مسلمانوں کے عقائد سے بالکل مختلف تھیں۔

ان کے پیچھے کچھ تو سیاسی اسباب تھے، کچھ خارجی اور کچھ اپنی ذہنی کاوشوں کا بھی نتیجہ تھا، جیسے قدریہ کے مقابلے میں ایک فرقہ پیدا ہوا جس کو "جبریہ" کہا جاتا تھا، اگر قدریہ افراط کا شکار تھے جس کی وجہ سے وہ سرے سے ہی قدر کا انکار کرتے تھے اور فعلِ خیر و فعل شر دونوں کا خالق بندے کو مانتے تھے، تو "جبریہ" تفریط کے جال میں پھسے ہوئے تھے، وہ تقدیر الٰہی کے آگے بندے کو مجبورِ محض مانتے تھے، ایسے جیسے وہ کوئی تنکا ہو جو ہوا کے سہارے پر ہو، ہوا اسے جدھر چاہے لے جائے۔ وہ مانتے تھے کے بندے کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے، جیسا اس کی تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے ویسا اس پر کرنا لازم ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی کلامی آراء وجود میں آئیں۔

انہیں حالات کو دیکھتے ہوئے علمائے حق، حق کا ساتھ دینے کے لیے اور مذہبِ اسلام پر اٹھ رہے اعتراضات کا قلع قمع کرنے کے لیے آگے بڑھے اور اس قافلہ رشد کی سالاری کا فریضہ امام الائمہ کاشف الغمہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے انجام دیا اور پھر انھیں کے اصول کو مزید توضیح و تشریح کے ساتھ ماوراء النہر کے علاقوں میں امام ابو منصور ماتریدی رحمۃ اللہ علیہ (ت:۳۳۳ھ) نے پیش کیا اور مذہب ماتریدی کے بانی کہلائے، اور مصر میں یہی کام امام ابو جعفر طحاوی رحمۃ اللہ علیہ (ت:۳۲۱ھ) نے انجام دیا۔

دوسری طرف عراق میں جب فتنہ اعتزال اپنے شباب پر تھا، تو اللہ تعالی نے انہیں میں سے ایک شخص کو راہِ حق دکھلائی، جس کے بعد وہ مذہب اعتزال سے توبہ کر کے مذہب اہل سنت کے داعی بن گئے اور آگے چل کر مذہب اشعری کے بانی کہلائے۔ دنیا انہیں امام حق امام ابو الحسن اشعری کے نام سے جانتی ہے۔

پھر ان دونوں مذہبوں میں لاکھوں ائمہ پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے اپنے امام کی

اتباع میں عقائد اہل سنت کے فروغ کے لیے اپنی زندگیاں صرف کر دیں اور مذہب حق کا اس تندہی سے دفاع کیا کہ آج جو اسلام کی بہاریں نظر آرہی ہیں انہیں کی جانفشانیوں کا نتیجہ ہیں۔

امام ابو منصور ماتریدی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد مذہب ماتریدی میں جو بڑے بڑے ائمہ ہوئے، ان کے نام درج ذیل ہیں:

ابو القاسم حکیم سمرقندی (ت: ۳۴۲ھ)، ابو الیسر بزدوی (ت: ۴۹۳ھ)، ابو المعین نسفی (ت: ۵۰۸ھ) (تبصرۃ الادلۃ کے مصنف)، نجم الدین عمر نسفی (ت: ۵۳۷ھ) (متن العقائد النسفیہ کے مصنف)، نور الدین صابونی (ت: ۵۸۰ھ) (البدایۃ من الکفایۃ کے مصنف)، ابو البرکات حافظ الدین نسفی (ت: ۷۱۰ھ) (العمدۃ فی عقیدۃ اہل السنۃ والجماعۃ و تفسیر نسفی کے مصنف)، صدر الشریعہ ثانی (ت: ۷۴۷ھ) (تعدیل العلوم و شرح الوقایہ کے مصنف)، سعد الدین تفتازانی (ت: ۷۹۳ھ) (شرح العقائد النسفیہ کے مصنف)، کمال ابن الہمام (ت: ۸۶۱ھ) (المسایرۃ کے مصنف)، مولی خضر بک (ت: ۸۶۳ھ) (قصیدہ نونیہ کے مصنف)، ابن کمال باشا (ت: ۹۴۰ھ) (مسائل الاختلاف بین الاشاعرہ والماتریدیہ کے مصنف)، کمال الدین البیاضی (ت: ۱۰۹۸ھ) (اشارات المرام کے مصنف)، عبد الحکیم سیالکوٹی (ت: ۱۰۶۷ھ) (حاشیۃ علی شرح العقائد النسفیہ، حاشیۃ علی تفسیر البیضاوی)، فضل رسول بدایونی (ت: ۱۲۸۹ھ)، امام احمد رضا خان (ت: ۱۳۴۰ھ)، محمد بخیت مطیعی (ت: ۱۳۵۴ھ)، پیر مہر علی شاہ (ت: ۱۳۵۶ھ)، امام محمد زاہد کوثری (ت: ۱۳۷۱ھ) رحمۃ اللہ علیہم۔

اور امام ابو الحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ کے بعد مذہب اشعری میں جو بڑے بڑے ائمہ

ہوئے ان کے نام بھی درج ذیل ہیں:

ابن سُریج (ت: ۳۰۶ھ)، ابو بکر باقلانی (ت: ۴۰۳ھ)، ابن فورک (ت: ۴۰۶ھ)، ابو اسحق اسفر ایینی (ت:۴۱۸ھ)، عبد القاہر جرجانی (ت: ۴۷۱ھ)، امام الحرمین جوینی (ت: ۴۷۸ھ)، امام غزالی (ت: ۵۰۵ھ)، ابن عساکر (ت: ۵۷۱ھ)، فخر الدین رازی (ت: ۶۰۶ھ)، ناصر الدین بیضاوی (ت: ۶۸۵ھ)، عضد الدین ایجی (ت: ۷۵۶ھ)، تاج الدین سبکی (ت: ۷۷۱ھ)، جلال الدین محلی (ت: ۸۶۴ھ)، امام محمد بن یوسف سنوسی (ت: ۸۹۵ھ)، شیخ الاسلام شیخ زکریا انصاری (ت: ۹۲۶ھ)، ابراہیم لقانی (ت: ۱۰۴۱ھ)، ابراہیم برماوی (ت: ۱۱۰۶ھ)، احمد دردیر (ت: ۱۲۰۱ھ)، عبد اللہ شرقاوی (ت: ۱۲۲۷ھ)، احمد بن محمد صاوی (ت: ۱۲۴۱ھ)، حسن عطار (ت: ۱۲۵۰ھ)، ابراہیم باجوری (ت: ۱۲۷۷ھ)، یوسف دجوی (ت: ۱۳۶۵ھ)، محمد متولی شعراوی (ت: ۱۴۱۹ھ) رحمۃ اللہ علیہم۔

ان تمام علمائے کرام نے علم کلام کی تدوین واشاعت، توضیح وتشریح، تنقیح وتسہیل اور تفہیم وبیان میں برابر حصہ لیا اور انہیں کے دوش کرم پر سوار ہو کر عقائد اہل سنت وجماعت ہم تک اس موجودہ شکل میں پہنچے، انہیں کی کوششوں سے قرآن وسنت کا دفاع ہوا، حق کو رفعت اور باطل کو ذلت ملی، ہدایت کے چراغ روشن ہوئے اور گمراہیت کی بدلیاں چھٹیں۔

اور یہاں پر یہ بات یاد رہے کہ دونوں ہی مذہب حق پر ہیں، اور دونوں ہی مذہب اہل سنت کے دو مختلف نام ہیں، جن میں صرف چند مسائل میں اختلاف ہے، ان میں سے بھی اکثر لفظی اختلاف کی قبیل سے ہیں جیسے ہم زید کو انسان کہیں اور ہمارا مقابل اسے بشر

کہے۔ اللہ تعالی ان سبھی کی خدمات قبول فرمائے اور ان کی تعلیمات پر عمل کرنے کی ہمیں توفیق بخشے!

مبادیاتِ علم کلام:

علم کلام کی تعریف: وہ علم جس میں یقینی دلیلوں کے ذریعہ دینی عقائد کی معرفت کے راستوں کی تلاش و جستجو ہو۔

علم کلام کا موضوع: معلومات اس حیثیت سے کہ ان سے عقائد دینیہ کا اثبات متعلق ہو۔

علم کلام کے واضع: جیسا کے اوپر گزر چکا ہے کہ اس کے واضع امام ابو منصور ماتریدی اور امام ابوالحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہما ہیں۔

علم کلام کی غرض وغایت: عقائد دینیہ کی معرفت کا حاصل ہونا۔

علم کلام کا ثمرہ: دنیا و آخرت کی کامیابی۔

علم کلام کے نام: فقہ اکبر، اصول الدین، علم توحید۔

علم کلام کے مسائل: اللہ تعالی کی اور انبیا و رسل کی ذات وصفات اور قرآن وسنت سے ثابت شدہ وہ امور جن کا تعلق غیب سے ہے، جیسے قیامت کے احوال، جنت ودوزخ، حساب و کتاب، عرش و کرسی وغیرہ۔

علم کلام کا حکم: اس کا سیکھنا فرضِ کفایہ ہے، اگر کچھ لوگوں نے اس میں سے اتنا علم سیکھ لیا جتنے سے وہ عقائد اسلام کو دوسروں کے سامنے بیان کر سکیں اور ان پر وارد ہونے والے شبہات کا رد کر سکیں، تو سب پر سے فرض ساقط ہو گیا ورنہ سب گنہ گار ہوں گے۔

علم کلام کا شرف: کسی بھی علم کا شرف ان میں پائی جانے والی معلومات سے طے ہوتا

ہے، اور چوں کہ اس علم کے معلومات کا تعلق اللہ تعالی کی ذات وصفات اور اس کے رسل وانبیا کی ذات وصفات سے ہے اور یہ تمام چیزوں میں سب سے اشرف واعلی ہیں اس لیے یہ علم بھی تمام علوم میں سب سے اشرف واعلی ہو گا۔

علم کلام کی دوسرے علوم کی طرف نسبت: علم کلام اصل ہے اور باقی دیگر علوم قرآن وسنت اس علم کی فرع ہیں، کیوں کہ جب تک صانع اور خالق کا وجود ثابت نہیں ہو گا، اور یہ ثابت نہیں ہو گا کہ وہ صفت کلام سے بھی متصف ہے تو اس وقت تک یہ کیسے ثابت ہو گا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور جب تک یہ نہیں ثابت ہو گا کہ محمد ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں تو اس وقت تک کوئی ان کی احادیث اور باتوں کو کیسے مان سکتا ہے!؟

عرضِ مترجم

تمام حمد وثنا اللہ وحدہ لاشریک کے لیے ہیں، جس کی قدرت قدیم وباقی نے اس قدرت حقیر و فانی کو یہ توفیق بخشی کہ اس کی اور اس کے پیاروں کی ذات وصفات کے حوالے سے کچھ خامہ فرسائی کرسکے، اس کی کُتُبِ منزّلہ اور ان میں جو بھی غیبیات وسمعیات وارد ہوئے ہیں ان کے متعلق اپنے قلمِ سراپا تقصیر سے کچھ الفاظ نکال کر لوحِ قرطاس پر بکھیر سکے۔۔۔ذَلِكَ فَضْلُ اللهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ۔

اور درودِ ابدی وسرمدی نازل ہو مصطفی جانِ رحمت ﷺ پر جن کے صدقے ہمیں سب کچھ ملا، دین ملا، ایمان ملا، دنیا ملی، عقبی ملی، انہیں کا سب کچھ ہے، انہیں سے سب کچھ ہے، وہ ہیں تو ہم ہیں وہ نہ ہوں تو ہم نہ ہوں:

"جان ہیں وہ جہان کی، جان ہے تو جہان ہے"!

ترجمہ کے لیے اس شرح کا انتخاب

یہ ترجمہ جو آپ کے ہاتھوں میں ہے، علمِ کلام کے مشہور وقدیم متن "العقیدۃ الطحاویۃ" کی شرح بابرتی کا اردو ترجمہ ہے، اب یہاں پر سب سے پہلا سوال ذہن میں یہ آتا ہے کہ اس متن کی یوں تو دسیوں شروحات لکھی گئیں ہیں، پھر ترجمہ کے لیے اسی شرح کا انتخاب کرنے کی وجہ کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس شرح میں معانی کی تدقیق، نگارش کی زیبائش، عقلی ونقلی دلائل کے ساتھ اپنے دعووں کو بیان کرنے کے لیے ایسا خوبصورت اور سائشتہ اسلوب استعمال کیا گیا ہے جو عوام وخواص سب کے لیے قابل

فہم ہے۔ اس شرح میں بہت سی جگہ ایسی بھی ہیں جہاں پر علم کلام کی معرکۃ الآراء مباحث کا نچوڑ عدل وانصاف کے ساتھ بہت عمدہ اور آسان لب ولہجے میں بیان کر دیا گیا ہے، جیسے یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ رہا ہی نہ ہو جتنا تعصب زدوں نے اسے بنایا ہوا ہے، یہ امام بابرتی رحمۃ اللہ علیہ کی وسعت نظری اور اعلی ظرفی کا عنوان ہے اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ علم کلام کی خشک اور گنجلک بحثوں کو اتنے مختصر، آسان اور ادبی پیرائے میں ڈھالا گیا ہے کہ مطالعہ کے وقت قاری بالکل بھی اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا جس طرح وہ اس علم کی دوسری کتابوں کے مطالعہ کے وقت محسوس کرتا ہے۔

اس شرح میں بہت سے مقامات پر مخالف مذاہب کی آراء کو بھی پیش کیا گیا ہے، اور ان کا مذہبِ اہل سنت سے موازنہ بھی کیا گیا ہے، مذہب ماتریدی اور مذہب اشعری کے درمیان بعض اختلافی مسائل کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے، لیکن چوں کہ اس کتاب کے ماتن وشارح دونوں کا تعلق مذہب ماتریدی سے ہے، اس لیے اختلاف کی صورت میں ترجیح مذہبِ ماتریدی کو ہی دی گئی ہے اور آخر میں اس ترجیح کی وجوہات ودلائل بھی پیش کر دیے گئے ہیں۔

یہ تمام خصائص واوصاف اس شرح کو مجموعی طور پر اس طرح خوبصورت بنا دیتے ہیں کہ اس کا حق بنتا ہے کہ اس کا ترجمہ کیا جائے، اب اور مزید تفصیل تو کتاب پڑھ کر ہی معلوم ہوگی اس لیے آیئے اسے چھوڑ کر اب تھوڑے سے اپنے وہ تجربات بھی آپ کے ساتھ بانٹ لوں جو تجربات مجھے اس ترجمے کے دوران حاصل ہوئے ہیں:

ابتدا میں جب صدیقِ محترم حضرت مولانا شیر از احمد ازہری صاحب نے اس کتاب کے ترجمے کی پیشکش مجھے کی، تو مجھے آپ کا یہ خیال بہت بھلا معلوم ہوا اور آپ کے حکم کی

تعمیل میں فوراًہاں کر دی، پر کچھ چیزیں اتنی آسان نہیں ہو تیں جتنی ابتدا میں نظر آتی ہیں، یہ احساس اس وقت بہت زیادہ ہو گیاجب اس ترجمے کے بیچ راستے پر میں پہنچا، اب میری حالت یہ تھی کہ "نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن"۔

اس ترجمے پر بہار و خزاں بہت سے موسم گزرے، اس نے بہت سے ملکوں کی سیر بھی کی، یونیورسٹی کا خوبصورت، بے فکر، مسکراتا ہوا کیمپس بھی دیکھا، ہسپتال کی لمبی، خاموش اور اداس راتیں بھی اس پر گزریں۔ ان سبھی بدلتی ہوئی رتوں میں جو چیز میرے لیے قرارِ جاں بنی وہ میرے رب کا یہ فرمان تھا:﴿أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ﴾[بقرہ:۲۱۴] "کیا تم نے گمان کر رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے، جب کہ ابھی تک تمہارے ساتھ وہ چیزیں پیش نہیں آئیں جو تم سے پہلوں کے ساتھ پیش آئی تھیں!؟" اب سوچتا ہوں تو لگتا ہے کہ یہ فرمان میرے جیسے لوگوں کے لیے ہی اترا تھا، قرآن کی شان ہی کچھ اس طرح کی ہے، کہ ہر قاری کو محسوس کراتا ہے کہ وہ ایک اسی کے غموں پر اطمینان کا پھاہا رکھنے کے لیے اترا ہے، جس سے ہر قاری، قرآن کو اپنے دل کے بہت قریب پاتا ہے۔ اور آخر کار یہ ترجمہ صاحبِ متن امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے قدموں میں بیٹھ کر اپنے اختتام کو پہنچا، جس میں میرے ساتھ عزیزم و برادرم اور میرے ہمنام مولانا اسماعیل قادری ازہری صاحب بھی تھے اور اس ترجمے کی پروف ریڈنگ کا اختتام استاذ الہند، بانی درسِ نظامی، ملا نظام الدین فرنگی محلی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ کے قدموں میں بیٹھ کر عمل میں آیا، جس میں میرے رفیق عزیزم مولانا جلال الدین چشتی فرنگی محلی تھے۔

ترجمہ کا طریقہ

اس ترجمے میں لفظی ترجمے سے زیادہ مفہوم کی ادائیگی پر توجہ دی گئی ہے، اس طرح

کہ اس میں اصل عبارت کی نزاکتیں بھی شامل ہوں، اس کے سوز و گداز کی مکمل ترجمانی بھی ہو، اس کے نشیب و فراز کے سارے مناظر بھی ترجمے میں اس طرح قید کر دیے گئے ہوں کہ پڑھنے والے کو اصل کا گمان ہونے لگے اور یہی ایک ترجمہ نگار کی سب سے بڑی کامیابی ہے، اس کاوش میں میں کتنا کامیاب ہوا ہوں یہ تو آپ کا ذوق فیصلہ کرے گا، اس لیے آپ کے ذوق پر اس کا فیصلہ چھوڑ رہا ہوں۔

ساتھ ہی ساتھ جہاں تک ہو سکا وہاں تک یہ کوشش بھی کی گئی ہے کہ فلسفہ اور کلام کی مشکل اصطلاحات جو کہ تمام کی تمام عربی زبان میں ہوتی ہیں ان کا عام فہم زبان میں ترجمہ کر دیا جائے؛ تاکہ پڑھے لکھے عوام کے سمجھنے میں بھی کوئی دشواری پیش نہ آئے اور اصل اصطلاح کا مفہوم بھی بگڑنے نہ پائے اس طرح سے یہ ایک نئی کاوش ہے، امید ہے کہ اردو زبان میں ترجمہ ہونے والی علم کلام کی کتب میں یہ ایک نیا اور انوکھا اضافہ ہو گا۔

اس کتاب میں آپ کو ترجمہ کے ساتھ ساتھ تحقیق و تخریج اور تعلیق بھی دیکھنے کو ملے گی، تحقیق میں کچھ نئی آراء بھی پیش کی گئی ہیں، اگر کسی امام یا پھر کسی کتاب کا ذکر آیا تو اس کا مختصر تعارف بھی پیش کر دیا گیا ہے اور اگر شرح میں کہیں اشارہ و تلمیح سے کام لیا گیا ہے تو قاری کی سہولت کا خیال کرتے ہوئے حسبِ ضرورت حاشیے میں اس کی تفصیل اور تشریح بھی ذکر کر دی گئی ہے۔

کہیں کہیں پر بات کی مکمل وضاحت اور عبارت کو عام فہم بنانے کے لیے کچھ الفاظ اپنی طرف سے بھی بڑھا دیے گئے ہیں جو کہ اصل متن یا شرح کا حصہ نہیں تھے اور امتیاز کے لیے انہیں مربع نما [۔۔۔] قوسین میں رکھا گیا ہے۔

کلمات شکر

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر اس گراں قدر موقع پر میں اپنے ان کرم فرما احباب کا ذکر نہ کروں جو آغاز سے اختتام تک میرے معاون ومددگار بنے رہے، ان میں صدیق محترم مولانا شیر از احمد ازہری صاحب اور دار الملک کی پوری ٹیم قابلِ ذکر ہے جس نے پہلے تو مجھے اس ترجمے کی پیشکش کی، پھر اس کے لیے ہر طرح کی مدد بھی کی۔ عزت مآب ڈاکٹر محمد سرور قادری صاحب حفظہ اللہ کا بھی خصوصی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے اپنا قیمتی وقت نکال کر بعض مقامات پر طبی مسائل کی تفہیم میں ہماری مدد کی، اگر وہ نہ ہوتے تو ان مسائل کے سمجھنے میں ہمارے لیے بہت دشواری ہو جاتی فله الشكر والدعاء۔

اور ان کے علاوہ اپنے سبھی احباب کا جنھوں نے کسی بھی طرح سے اس کارِ خیر میں ہمارا تعاون کیا، اللہ تعالی ان سبھی کو اپنے حفظ وامان میں رکھے!

آخر میں اللہ تعالی کی بارگاہ میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالی اس ادنی سی خدمت کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے، تادم مرگ ہمیں اپنی عزت اور اپنے نبی کی ناموس پر پہرا دینے کی توفیق عطا فرمائے، اس کاوش کو میرے، میرے والدین کریمین، میرے اساتذہ کرام، میرے بھائی بہن، میرے عزیز واقارب اور ہر اس شخص کی جس نے اس کام میں تھوڑا سا بھی حصہ لیا اور ہر قاری کی نجات کا ذریعہ بنائے! آمین۔

محمد اسماعیل ازہری لکھنوی

فاضل جامعہ ازہر (کلیہ اصول الدین، قسم العقیدہ والفلسفہ) قاہرہ، مصر

۱۶/ ذی الحجہ ۱۴۴۴ھ مطابق ۵ جولائی ۲۰۲۳ء بروز بدھ

فیض آباد، اتر پردیش، انڈیا

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مقدمہ شارح

تمام حمد وستائش اللہ کے لیے جس کا وجود واجب ہے، جس کی بقا کے لیے کبھی فنا نہیں، جس کی جود وعطا کا دائرہ بڑا وسیع ہے، جس کا احسان وکرم ہمیشہ سے ہے، جس کا فضل ہر ایک کو عام ہے، جو اپنی ذات میں ہر شبیہ ومثال سے پاک اور اپنی صفات میں تغیر وزوال سے پرے ہے! اور درود وسلام نازل ہو رسول اللہ ﷺ پر جن کو اس نے حق کا داعی بنا کر، سر پر خلق کی ہدایت کا تاج سجا کر، اس دنیا میں بھیجا، ان کی آل اور ان کے اصحاب پر بھی جو ہدایت کے علم بردار اور کفر وضلالت کی تاریکیوں کے لیے ہدایت کے درخشاں چراغ ہیں۔

"علمِ اصول الدین" کو تمام علوم میں پہلا مقام حاصل ہے، ایک عقل والے پر سب سے پہلے اسی علم کا سیکھنا فرض ہے، کیوں کہ اس کے ذریعہ معرفتِ الٰہی حاصل ہوتی ہے، جو کہ ہر علم کی اصل اور ہر سعادت کا سرچشمہ ہے، اسی معرفت کے واسطے تمام انس وجن کو پیدا کیا گیا ہے۔ جیسا کہ: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ [الذاریات:۵۶]

"اور ہم نے انس وجن کو صرف عبادت کے لیے پیدا کیا ہے"۔ کی جو تفسیر "ترجمان القرآن" ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے کی ہے اس سے پتا چلتا ہے۔ نبی ﷺ نے اس کو "رأس العلم" یعنی اصل العلم فرمایا ہے، جس کا ذکر اس قصے میں ملتا ہے:

ایک مرتبہ ایک اعرابی نے آقا ﷺ سے عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہمیں "غرائب العلم" یعنی کسی نئے اور انوکھے علم کے بارے میں کچھ بتائیے، اس پر

رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اس سے پوچھا: «"اصل العلم" کے بارے میں بھی کچھ جانتے ہو؟» تو انہوں نے آقا صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے پوچھا کہ اصل العلم کیا ہے؟ اس پر آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: «معرفتِ الٰہی!» [(۱)]۔

اس کی افضلیت کا راز اس بات میں پوشیدہ ہے کہ علم کا شرف اس علم میں پائی جانے والی معلومات سے طے ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ چوں کہ تمام موجودات میں سب سے افضل و برتر ہے اس لیے تمام علوم میں اس علم کو بھی سب سے اعلیٰ اور برتر مقام حاصل ہوگا جس علم کا موضوع ذاتِ باری تعالیٰ ہو! پھر ظاہر ہے تعظیم و تکریم کا حق دار بھی ان میں سب سے زیادہ یہی علم ہوگا، اس درجہ کہ اس کی تحصیل کے بغیر نجات کی کوئی امید نہیں ہے اور نہ ہی اس تک پہنچے بغیر کامیابی کا کوئی سرا ہاتھ آسکتا ہے۔

اس علم میں لوگ فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں لیکن ان میں نجات والا فرقہ وہی ہے، جس کی طرف نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اپنے اس فرمان میں اشارہ فرمایا ہے: «"جس ذات کے قبضہ قدرت میں محمد کی جان ہے اس کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میری امت ایک دن تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی، جن میں صرف ایک فرقہ جنتی ہوگا اور باقی بہتر جہنمی۔» سوال کیا گیا: یا رسول اللہ! وہ کون لوگ ہوں گے؟ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: «اہل سنت وجماعت»، پھر سوال کیا گیا: سنت وجماعت کون لوگ ہیں؟ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: «جو میرے اور میرے صحابہ کے راستہ پر چلیں گے» [(۲)]۔

---

(۱) أخرجه وكيع في الزهد (١٤)، وأبو نعيم في الحلية (١، ٢٤)، وابن عبد البر في جامع بيان العلم وفضله (١٢٢٢).

(٢) أخرجه الترمذي (٢٦٤١).

اس لیے جو عقل والا ہو گا وہ اہلِ سنت وجماعت کے راستہ کو اپنے لیے راہِ نجات جانے گا اور نفس کے پرستاروں اور بدعت کے وفاداروں کے راستے سے گریز کرے گا، کیوں کہ جس راستے پر صحابہ، ان کے بعد تابعین، پھر اسلاف صالحین چلے ہوں وہی سب سے اچھا راستہ ہو گا۔ اسلاف کے اسی مذہب کی نشر واشاعت کرنے کا بیڑا بہت سارے ائمہ اسلام اور میدانِ کلام کے شہ سواروں نے اپنے سر اٹھالیا، پھر اسی مقصد کی بازیابی کے لیے انہوں نے تصنیف وتالیف کو بھی وسیلہ بنایا، چنانچہ ان میں سے کچھ تو وہ ہیں جنہوں نے اس سلسلے میں تطویل سے کام لیا، کچھ نے توسط کی راہ اختیار کی اور کچھ نے اختصار کو اپنا طریقہ کار بنایا۔

[شرح لکھنے کا سبب:]

انہیں مختصرات میں سے علم کے بحر ناپیدا کنار، حضرت امام ابو جعفر طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ایک مختصر ہے جس کے افق پر بکھرے ہوئے علمی ستارے، اس کے حسن میں چار چاند لگا رہے ہیں۔ اس کے مختصر مگر موتی جیسے نایاب نکات، بیان میں جادو پیدا کر رہے ہیں۔ نگارش کی شیرینی اور فوائد کی کثرت کی وجہ سے ہر ایک اس کو پڑھنے کی تمنا اپنے دل میں رکھتا ہے، ہر ایک زبانی اس کو یاد کرنا چاہتا ہے۔ انہیں سب وجوہات کی بنا پر اس کی ایک ایسی شرح لکھنے کا ارادہ کیا جو مختصر ہو، پر اس میں یہ خوبی ہو کہ وہ اس کے اسرار کو بیان کر سکے، اس کی پیچیدگیوں کو واضح کر سکے اور اس کی الجھنوں کو دور کر سکے۔ شرح لکھتے وقت اللہ ہی پر اعتماد تھا اور ہے، جس کے در سے خیر وسخا کے سارے فیض جاری ہوتے ہیں اور وہی ایک تنہا ذات ہے جو ہر موجود کو وجود کی پوشاک پہناتی ہے۔

چونکہ یہ شرح اپنے انجام کو پہنچتے پہنچتے حسن وجمال کی آخری حد کو پہنچ گئی، اسی

طرح دیکھتے دیکھتے اس میں موجود پر لطف رموز و کنایات کا حسین امتزاج نظر آنے لگا، اس لیے ایک مدت تک میں سوچتا رہا کہ آخر کس ذات سے اس کام کو منسوب کروں کہ اس کی برکت سے ہمیشہ کے لیے یہ محفوظ ہو جائے!؟ آخر میں میں نے اپنے دل کو تمام شکوک وشبہات سے پاک کیا اور عالم غیب سے لو لگائی، پھر یکایک عالم قدس کی طرف سے میرے دل میں یہ بات ڈالی گئی کہ اس بارگاہ میں اس کو ہدیہ بنا کر پیش کروں؛ جو برجِ سعادت سے روشن و تاباں چاند بن کر طلوع ہوا، جس کے آنے سے دلوں کو خوشی و مسرت کی سوغات ملی، جو حسن وجمال میں رشکِ جناں بن گیا، جس کی رفعتیں آسمان کی رفعتوں کی برابری کرنے لگیں، اس پر برکت کے آثار کچھ اس طرح نمودار ہوئے کہ عمل کے میدان میں سعادت وتوفیق دونوں کا سنگم بن کر سامنے آئے، ان کی پیشانیٔ ناز پر خوش بختی کی ایسی علامتیں چمکیں کہ اس سے سیادت و رہبری کی پو پھوٹنے لگیں! وہ کوئی اور نہیں بلکہ امیر معظم آقائے جلیل، سیف الدین، شیخ الملک الناصری **صرغتمش** ہیں[1]۔ آپ جلالتِ شان

(۱) ان کا پورا نام: امیر سیف الدین صرغتمش بن عبد اللہ الناصری ہے، جو کہ پہلے سلطان الناصر محمد بن قلاوون کے غلام ہوا کرتے تھے، پھر ان کی ذہانت وفطانت کی وجہ سے ان کے منصب میں ترقیاں ہوتی گئیں حتی کہ مملوکی حکومت کے بڑے عہدے داروں میں آپ کا شمار ہونے لگا اور امیر شیخون کے ساتھ مل کر جو کہ اس وقت مملوکی حکومت میں کافی اثر و رسوخ رکھتے تھے، حکومت کے بہت سے معاملات کی باگ ڈور خود سنبھالنے لگے۔ جس کے سبب سلطان ناصر محمد بن قلاوون کو اپنی حکومت کے راستے میں آپ کی ذات سے خطرہ محسوس ہونے لگا، انہوں نے اس خطرے کو بھانپتے ہی آپ کو اسکندریہ کے قید خانے میں قید کروادیا، اور اسی قید کی حالت میں ۷۵۹ھ میں آپ کا وصال ہو گیا۔

آپ کی ذات بہت سی خوبیوں کی جامع تھی۔ آپ کی فطرت خشک طبع واقع نہیں ہوئی تھی، بلکہ آپ تمام علوم وفنون میں برابر حصہ لیتے تھے، عربی زبان اور فقہ میں بحث ومباحثہ کرتے تھے، علماء سے بہت محبت

اور عظمت ورفعت کے مالک ہیں۔ پوری دنیا میں حکمران واُمرا کو آپ پر فخر ہے۔ فُقرا ومساکین آپ کی بارگاہ میں پناہ لیتے ہیں۔ یکتائے روزگار اور زینتِ ملک آپ ہیں۔ فیض وسخا کے سوتے آپ کے در سے پھوٹتے ہیں۔ تلوار و قلم، دونوں ہی ہتھیاروں پر آپ کو دسترس ہے۔ علمی اور عملی دونوں میدانوں میں سرخ روئی آپ کو ملی۔ دینی ودنیوی دونوں سعادتیں آپ کی جھولی میں آئیں۔ ہدایت کا نور آپ کی پیشانی سے پھوٹتا ہے۔ تقوی کا پرچم آپ کے ہاتھ میں بلند رہتا ہے۔ بڑے بڑے سمندر بھی اپنی تمام تر وسیع دامنی کے باوجود آپ کے فضل کے آگے سر خمیدہ ہیں۔ وسیع وعریض صحرا وجنگلات بھی اپنی فراخیوں کے باوجود آپ کے احسان و سخا کے سامنے شرمارہے ہیں۔ اللہ تعالی آپ کی عزتوں کو دوام بخشے! اور اپنی عنایات وبرکات کا کوئی چھینٹا آپ کے خزانے میں بھی ڈال دے! دشمنوں سے آپ کو محفوظ رکھے! اور ہمیشہ آپ کو سرور بخشے! کیونکہ اس زمانے میں آپ عُلما اور فُضلا پر نوازشیں فرماتے رہتے ہیں، اسی وجہ سے الحمد للہ، اللہ تعالی کی آپ پر کچھ اس طرح سے عنایتیں ہوئیں کہ عوام ہوں یاخواص، ہر ایک کی زبان آپ کی ثناکرتے نہیں تھکتی، ہر ایک آپ کے احسانوں تلے دبا ہوا ہے۔ جس کے افق پر اس قدر صفات ومناقب چاند تاروں کے مانند ٹمٹمارہے ہوں، وہ اس لائق ہے کہ دیباچہ کتاب کو اس کے القاب سے شرف بخشا جائے، ان کی جناب کی طرف اس کتاب کو منسوب کیا جائے، تاکہ

کرتے تھے اور ان کی صحبت کو ہر چیز پر فوقیت دیتے تھے، اپنے بنائے ہوئے مدرسہ کو جو کہ اپنے وقت میں معماری وفن کاری کا اعلی نمونہ تھا، علمائے حنفیہ کے لیے وقف کرر کھا تھا، صوم وصلوۃ کی بھی پابندی تھی، لیکن ان کی زندگی میں ظلم وجبر کی بھی مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اللہ تعالی ان کی نیکیوں کے صدقے ان کی خطاؤں کو بخش دے! (الیوم السابع، عربی الیکٹرانک اخبار)

کتابوں اور دفتروں میں قیامت تک کے لیے لوگوں کے ذہن و دل میں آپ کا نام محفوظ ہو جائے! مدت سے میں آپ کی خدمت میں کوئی تحفہ پیش کرنا چاہتا تھا، لیکن میرے سامنے مشکل یہ تھی کہ میں کوئی ایسا تحفہ پیش نہیں کر سکتا تھا جس کو رات و دن وہ خود لٹاتے رہتے ہیں، اور اس طرح کے ہزاروں بیش قیمت تحفوں سے ان کا خزانہ بھرا پڑا ہے۔ پھر مجھے متنبی کا یہ شعر یاد آگیا:

ہدیہ دینے کے لیے تمہارے پاس نہ تو گھوڑا ہے اور نہ ہی مال

تو پھر اپنی زبان سے خوش کرو، اگر خوش نہ کر سکے تمہارا حال

جب مجھے محسوس ہوا کہ اگر کوئی چیز انہیں سب سے زیادہ پسند ہے تو وہ علم ہے اور یہی ایک ایسا تحفہ ہے جس کی ان کے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت ہے، تو میں نے اسی وقت یہ فیصلہ کر لیا کہ اس شرح کا تحفہ ان کی بارگاہ میں پیش کروں گا۔ ان کی بارگاہ کرم سے امید ہے کہ وہ اسے شرف قبولیت بخشیں گے! اگر زندگی نے وفا کی اور میری امید بر آئی تو میں ان کے لیے فقہ میں کوئی کتاب لکھوں گا جس کی عبارت آسان اور واضح ہو گی اور ساتھ ہی ساتھ فقہ کی بڑی بڑی کتابوں میں موجود مسائل کا اس میں خلاصہ ہو گا۔ اللہ ہی کی جانب سے توفیق ہے اور وہی سیدھی راہ دکھانے والا ہے۔

* * *

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

[خطبہ]

یہ دین کے فقہا یعنی ابو حنیفہ نعمان بن ثابت، ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم انصاری اور ابو عبد اللہ محمد بن حسن شیبانی کے مذہب، مذہب اہل سنت وجماعت کے عقیدے کا ذکر اور دین کے ان اصول کا بیان ہے جن کا وہ عقیدہ رکھتے ہیں اور جس کے ذریعہ پروردگارِ عالم کے دین کا پٹہ وہ اپنی گردن میں ڈالتے ہیں۔

اگر مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے خطبے کو بقیہ کتاب سے پہلے لکھا ہے تو "هذا" یعنی "یہ" کے ذریعہ جس چیز کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے وہ ان کے ذہن میں موجود ہوگی۔ جیسا کہ صاحبِ منظومہ نے (منظومہ)[1] میں فرمایا: یہ کتاب (فقہی) اختلافات کے بیان میں ہے۔
اور اگر انہوں نے کتاب مکمل کرنے کے بعد یہ خطبہ لکھا ہے تو اس "یہ" سے جس چیز کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے وہ (کتاب کی شکل میں) خارج میں موجود ہوگی۔
"عقيدة" "فصيلة" کے وزن پر ہے جو کہ مفعول یعنی "معقود" کے معنی میں ہے، جس کا مطلب ہوتا ہے ایسی بات جس پر دل کی گرہ بند کر دی گئی ہو اور اس کا عزم مصمم کر لیا گیا ہو۔ جب کسی کا دل کسی بات پر جم جائے تو ایسے شخص کے لیے اہلِ عرب اپنی زبان

---

(۱) اس کتاب کا پورا نام ہے "المنظومة في الخلافيات" ہے جو کہ فقہی اختلافات کے موضوع پر امام ابو حفص عمر النسفی رحمۃ اللہ علیہ (۵۳۷ھ ت) کی لاجواب تصنیف ہے۔ اس کو آپ نے دس ابواب پر ترتیب دیا ہے، جس میں آپ نے امام اعظم اور ان کے اصحاب کے درمیان ہونے والے اختلافات اور اسی طرح علمائے حنفیہ وشافعیہ ومالکیہ وغیرہ کے درمیان ہونے والے اختلافات کو بیان کیا ہے۔

میں کہتے ہیں: "اعتقَدَ فُلانٌ کَذا" یعنی فلاں نے اس بات کا عقیدہ رکھ لیا اور اس کا عزم مصمم کر لیا۔

اب رہی یہ بات کہ "علمِ اصول الدین" کو عقیدہ کیوں کہتے ہیں؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا بھی تعلق دل میں موجود عقیدے سے ہوتا ہے، ظاہری اعمال سے نہیں ہوتا، اس لیے اس علم کو حاصل کرنے کا اصل مقصد بھی نفسِ علم ہے، بر خلاف علمِ فروع (فقہ) کے، کیوں کہ اس کا اصل مقصد ظاہری اعمال کرنا ہے، جیسے نماز وغیرہ۔

اور "**اہل**" کا مطلب ہوتا ہے کسی شے کو لازم و ضروری جاننے والا اور "**سنّۃ**" کا لغت میں معنی ہوتا ہے راستہ۔ اور شریعت میں "سنۃ" اس طریقے اور راستے کو کہتے ہیں جس پر دین میں چلا جائے۔

اور کبھی کبھی اس کا استعمال نبی ﷺ اور ان کے علاوہ صحابہ کی سنت کے لیے بھی ہوتا ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے: «تم پر میری اور میرے خُلفا کی سنت کی اتباع لازم ہے»[1]۔

لیکن یہاں پر اس سے مراد وہ راستہ ہے جس راستے پر نبی ﷺ تھے اور جس کی دعوت کا حکم اللہ تعالی نے انہیں اس فرمان میں دیا تھا: ﴿قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي﴾ [يوسف:۱۰۸] "آپ فرما دیجیے: یہ میرا راستہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں اور جو میرے قدموں پر چلیں، دل کی آنکھیں رکھتے ہیں"۔ اور **جماعت** سے مراد صحابہ اور تابعین ہیں، جو ہدایت میں آقا کریم ﷺ کے راستے پر چلنے

---

(۱) أخرجه الترمذي (۲٦٧٦)، والحاكم في المستدرك (۳۲۹)، وابن ماجه (٤۳).

والے ہیں، اسی بات کی طرف نبی ﷺ کے اس فرمان میں اشارہ کیا گیا ہے: « یہ وہ راستہ ہے، جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں »۔

اس راستے کو "اہلِ سنت وجماعت" کا راستہ اس لیے کہا جاتا ہے کیوں کہ یہ راستہ نفس کے پرستاروں اور بدعت کے وفاداروں کے راستے سے بالکل الگ ہے۔

اور **"مذہب"** کا (لغوی) معنی ہوتا ہے جانے کی جگہ یعنی وہ راستہ جس پر چلا جائے۔

اور عرف میں اس راستے کا نام مذہب پڑ گیا جس پر آکر کسی مجتہد کی رائے ٹھہر گئی ہو، یعنی کسی مجتہد کی آراء کا مجموعہ۔ کہا جاتا ہے: "مذهبُ ابي حنيفة رحمہ اللہ" کیوں کہ اس کا اطلاق ان احکام کے مجموعے پر ہوتا ہے جن پر امام صاحب کی رائے آکر ٹھہر گئی ہو۔ جیسے وہ آگے آگے اور ان کے متبعین ان کے پیچھے پیچھے، اس مخصوص راستے پر چلے ہوں۔

اور **"فُقہاء"**: فقیہ کی جمع ہے جو کہ "فقُہ" (قاف کے ضمہ کے ساتھ) سے مشتق ہے۔ اس کلمے کا استعمال اس شخص کے لیے کیا جاتا ہے، فقہ جس کی فطرت بن گئی ہو! اور یاد رہے کہ یہ "فقِہ" (قاف کے کسرہ کے ساتھ) سے مشتق نہیں ہے کیوں کہ (اس کا استعمال اس سمجھ کے لیے ہوتا ہے) جو سمجھ ابھی اس درجے کو نہیں پہنچی ہو کہ وہ فطرت بن جائے۔ جیسا کہ شاعر کا شعر ہے:

سخی کبھی کبھی بخل سے کام لے سکتا ہے

لیکن اس کو اس کے بخل پر نہیں بلکہ سائل کی نحوست پر محمول کرنا چاہیے

اور **"فقہ"** کا معنی لغت میں ہے: ایسی دقیق سمجھ، جو کسی قرینہ کی محتاج نہ ہو۔ کیوں کہ یہ نہیں کہا جاسکتا: "فقهت بأنَّ السماءَ فوقَ الأرضِ" یعنی میں سمجھ گیا کہ آسمان زمین کے اوپر ہے!

اور اصطلاح میں فقہ کی تعریف یہ کی گئی ہے: دلیلوں کے ذریعہ احکام شرعیہ کو جاننا۔
لیکن امام فخر الاسلام رحمۃ اللہ علیہ [1] نے اس تعریف میں عمل کا بھی اضافہ کیا ہے جس کی شکل کچھ اس طرح ہو گی: "دلیلوں کے ذریعہ احکام شرعیہ کو جاننا اور ان پر عمل بھی کرنا"۔ اس اضافے کی ضرورت اس لیے پڑی تا کہ محض علم ہی مقصود نہ رہ جائے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فقہ کی تعریف اس طرح فرمائی ہے: نفس کا یہ پہچاننا کہ کس چیز میں اس کے لیے بھلائی ہے اور کس چیز میں اس کے لیے برائی ہے۔ یعنی طاعت بجالا کر بشکل ثواب جس چیز سے فائدہ اٹھایا جائے (اس کا پہچاننا) اور معصیت ونافرمانی کر کے بشکل عقاب جس چیز سے نقصان پہنچے (اس کا بھی پہچاننا)۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے دونوں اصحاب کو "فقہاء الملۃ"۔ جس کا اصطلاح میں معنی ہوتا ہے: وہ دین حنیف جس کو لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ کے نام سے اس لیے تعبیر کیا، کیوں کہ علماء کے درمیان ان کی شان سب سے عالی تھی، (احکام کا استنباط کرنے میں) جن دلائل وبراہین کا انہوں سہارا لیا وہ سب سے زیادہ قوی تھے، اصول وفروع کی راہیں سب سے پہلے انہیں نفوسِ قدسیہ نے توہموار کی تھیں۔ نقل وعقل کے درمیان توازن آپ ہی لوگوں نے توپیدا کیا تھا!

اور اس تعبیر کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ فقیہ اسے کہتے ہیں جو دلائل کے ساتھ احکام شرع کو جانتا ہو اور ان پر عمل بھی کرتا ہو۔ اس اعتبار سے اگر ان ائمہ کو دیکھیے تو ان کے

---

(۱) ان کا پورا نام فخر الاسلام ابو الیُسر علی بن محمد البزدوی ہے۔ آپ اصولی، فقیہ، محدث اور مفسر ہیں، ان سبھی علوم میں آپ کی جلیل القدر تصانیف ہیں، جن مین شرح الجامع الکبیر اور اصول البزدوی بہت مشہور ہیں۔ آپ کی وفات ۴۸۲ھ میں ہوئی۔

یہاں دونوں چیزوں کے جلوے دیکھنے کو ملتے ہیں۔

رہا ان کا علم: تو اس کی شہادت کے لیے بس اتنا کافی ہے کہ مشرق و مغرب بلکہ ہر چہار جانب ان کے علم کے آثار بکھرے پڑے ہیں۔ امام وکیع رحمۃ اللہ علیہ(۱) نے فرمایا کہ علم فقہ اور علم کلام میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے لیے علم و معرفت کے جو در کھلے وہ ان کے علاوہ کسی اور کے لیے نہیں کھلے۔ امام حسین رحمۃ اللہ علیہ(۲) نے فرمایا: میں نے نضر بن شُمیل(۳) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ لوگ فقہ سے غافل ہو کر سوئے ہوئے تھے، پھر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فقہ کی نوک پلک سنوار کر، اس پر وضع و بیان کا ملمع چڑھا کر، اسے تلخیص کی حدوں سے گزار کر؛ ان سب کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا۔

---

(۱) آپ کا نام وکیع بن جراح ہے اور کنیت ابو سفیان ہے، آپ جلیل القدر محدث، مفسر اور متکلم ہیں اور اپنے زمانے میں محدثِ عراق کے لقب سے مشہور تھے۔ آپ کے تلامذہ کی فہرست میں محمد بن ادریس شافعی، احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، عبد اللہ بن المبارک اور علی بن المدینی جیسے جلیل القدر ائمہ کرام شامل ہیں۔ آپ کا سن وفات ۱۹۶ھ یا پھر ۱۹۷ھ ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ان دو مشہور شعروں میں آپ ہی کا ذکر فرمایا ہے:

شَكَوْتُ إِلَى وَكِيعٍ سُوءَ حِفْظِي　　فَأَرْشَدَنِي إِلَى تَرْكِ المَعَاصِي
وَأَخْبَرَنِي بِأَنَّ العِلْمَ نُورٌ　　ونُورُ الله لا يهدى لعاصي

(۲) آپ کا پورا نام حسین بن حریث بن الحسن بن ثابت المروزی اور کنیت ابو عمار ہے۔ ۲۴۴ھ میں سفر حج سے واپسی پر آپ کا انتقال ہو گیا۔ (تہذیب التہذیب)

(۳) آپ کا نام نضر بن شُمیل بن خرشہ (ویکیپیڈیا) اور کنیت ابو الحسن تھی۔ آپ کو اہل عرب کے حالات، روایتِ حدیث اور فقہ و لغت میں درک حاصل تھا، لغت میں آپ خلیل کے شاگرد رشید ہیں اور یحیی بن معین اور علی المدینی جیسے محدثین نے آپ سے احادیث روایت کی ہیں، خراسان کے علاقے "مرو" میں آپ نے ہی سب سے پہلے احادیث کی نشر و اشاعت کی ہے۔ آپ کی وفات ۲۰۳ھ یا پھر ۲۰۴ھ میں ہوئی۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے صحیح روایت ہے: آپ نے فرمایا کہ فقہ میں ہر شخص امام ابو حنیفہ کا محتاج ہے۔ احمد بن صباح رحمۃ اللہ علیہ (۱) نے فرمایا کہ میں نے امام شافعی کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میں نے امام مالک بن انس سے عرض کی کہ کیا آپ نے کبھی امام ابو حنیفہ کو دیکھا ہے ؟ اس پر آپ نے فرمایا: ہاں میں نے ایک ایسے شخص کو دیکھا ہے کہ اگر وہ یہ دعوی کرے کہ وہ اس کشتی کو سونے کی ثابت کر دے گا تو اس پر بھی وہ حجت قائم کر دے گا۔

اور رہا عمل: تو اس کے تعلق سے حضرت علی بن زید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: میں نے امام ابو حنیفہ کو دیکھا کہ وہ ماہ رمضان میں ساٹھ بار قرآن ختم کیا کرتے تھے، ایک قرآن رات میں اور ایک دن میں۔

حضرت حفص بن غیاث رحمۃ اللہ علیہ (۲) نے فرمایا: "امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے چالیس سال

---

(۱) آپ کا پورا نام احمد بن الصباح بن ابی سُریج اور کنیت ابو جعفر ہے۔ آپ کا شمار ثقہ راویوں میں ہوتا ہے۔ امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کا شمار حُفاظِ قرآن کے چھٹے طبقے میں کیا ہے۔ آپ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ نجیب اور امام بخاری کے شیوخ میں سے ہیں۔ آپ کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ ابن جزری رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کا سن وفات ۲۳۰ھ ذکر فرمایا ہے اور امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے ۲۴۱ھ سے ۲۴۳ھ میں سے کوئی ایک سن ذکر فرمایا ہے۔

(۲) آپ کا پورا نام حفص بن غیاث ابن طلق بن معاویہ النخعی الکوفی اور کنیت ابو عمر ہے۔ آپ تیرہ سال تک کوفہ کے اور دو سال تک بغداد کے منصبِ قضا پر فائز رہے۔ آپ نے سفیان ثوری، سلیمان الاعمش، ہشام بن عروہ اور ابن جُریج وغیرہ سے روایت کی ہے۔ آپ کا شمار ثقہ راویوں میں ہوتا ہے، الا یہ کہ آخری عمر میں آپ کا حافظہ کمزور ہو گیا تھا، اس لیے اس وقت جس نے ان کی کتاب سے روایت سنی وہ روایت اس روایت سے زیادہ صحیح ہے جو روایت اس وقت انہوں صرف اپنے حافظے پر اعتماد کرتے ہوئے بیان کی۔ ابن مدینی فرماتے ہیں کہ یحی بن سعید القطان ہم لوگوں سے فرمایا کرتے تھے کہ جن لوگوں نے اعمش سے روایت کی

تک آخری وقت کی عشا کے وضوسے فجر کی نماز پڑھی"۔

اس کے علاوہ بھی علم و عمل میں ان کے بے شمار مناقب ہیں، کہ ان کی کوئی حد نہیں۔

امام المحدثین امام ابو جعفر طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک چوں کہ یہ بات متحقق تھی کہ یہ سبھی لوگ علم و عمل دونوں میدانوں کے شہ سوار ہیں اور ان کے مذہب پر اہل سنت وجماعت کا اعتماد ہے، اسی لیے آپ نے انہیں "فقہاء الملۃ" کے نام سے یاد کیا اور ان کے مذہب کو اختیار کیا۔ چوں کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ صحابہ کرام کے دور میں پیدا ہوئے تھے، ان میں سے بعض سے آپ نے روایت بھی کی،[1] اور تابعین کے زمانے میں علم فقہ میں

ان میں سب سے زیادہ ثقہ راوی حفص بن غیاث ہیں۔ (الکواکب النیرات فی من اختلط من الرواۃ الثقات لابن الکیال)

(۱) متعصب اور معاند کے سوا ہر ایک امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی بعض صحابہ کے ساتھ اصل صحبت پر متفق ہے، چنانچہ امام خطیب بغدادی نے "تاریخ بغداد" میں امام ذہبی نے "الکاشف" میں اور امام یافعی نے "مرآۃ الجنان" میں، ان کے علاوہ اور بھی بہت سے محدثین ومورخین نے اس بات کو لکھا ہے کہ آپ کی صحابیِ رسول حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے صحبت ثابت ہے۔ بعض نے ان صحابہ کرام کی تعداد سات بتائی ہے جن سے آپ کو شرف صحبت حاصل ہوا ہے، بعض نے ان سے کچھ زیادہ اور بعض نے ان سے کم، ان صحابہ کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

انس بن مالک (۹۳ھ ت) ابو الطفیل عامر بن واثلہ الکنانی (۱۰۲ھ ت) پوری روئے زمین پر صحابہ کرام میں آپ کی وفات سب سے آخر میں ہوئی، عبد اللہ بن ابی اوفی الاسلمی (۸۷ھ ت) سہل بن سعد الساعدی (۹۱ھ ت) عبد اللہ بن جزء الزبیدی (۸۶ھ ت) واثلہ بن الاسقع (۸۳ھ ت / ۸۵ھ ت)۔

اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ وہ روایات جن سے آپ کی تابعیت کا ثبوت ملتا ہے ضعیف ہیں، پھر بھی یہ ضعف آپ کی تابعیت کے پہلو کو کمزور نہیں کر سکتا، کیوں کہ "تابعیت "فضائل کے باب میں سے

آپ کا شہرہ ہو گیا، ان میں سے بعض سے آپ نے علمی مناظرے بھی کیے۔ ان تمام چیزوں سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کو بھی تابعی ہونے کا شرف حاصل تھا۔ قرآن کریم کے مطابق اللہ تعالی ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔ نبی ﷺ نے خود ان نفوسِ قدسیہ کی بہتری کی گواہی کچھ اس انداز میں دی ہے: «سب سے بہتر زمانہ میرا زمانہ ہے پھر اس کے بعد والوں کا»[1]۔ (حدیث)

یہ دین کے ان اصول کا بیان ہے جن پر وہ لوگ عقیدہ رکھتے تھے۔

اعتقاد کا معنی پیچھے گزر چکا ہے، اور اصول الدین "مرکب اضافی" ہے، جو کہ ایک مخصوص علم کا نام ہے۔ عَلَم یعنی نام ہونے کے لحاظ سے اس کی تعریف یہ کی گئی ہے:

علم اصول الدین اس علم کو کہتے ہیں جس میں اللہ کے اسماء وصفات اور اس کے افعال

ہے، اور فضائل کے باب میں حدیث ضعیف بھی معتبر ہے۔ حالاں کہ وہ سند جس سے آپ کی لقاء اور صحبت ثابت ہو رہی ہے، اس کے بارے میں ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "سند لا بأس بہ" (تبييض الصحيفة بمناقب ابی حنیفۃ) اور ان الفاظ سے راوی کی عدالت ثابت ہوتی ہے۔

اب اس بارے میں اختلاف ہے کہ آپ نے ان صحابہ میں سے کسی سے کوئی حدیث روایت بھی کی ہے یا نہیں؟ بعض اس کا انکار کرتے ہیں اور بعض کے نزدیک ان صحابہ سے آپ کی روایت ثابت ہے۔ اور تحقیق یہ ہے کہ آپ نے ان صحابہ میں سے بعض سے روایت بھی کی ہے، کیوں کہ جب راوی اور مروی عنہ کے درمیان معاصرت ثابت ہو گئی تو پھر بلا وجہ اور بغیر دلیل کے ان سے سمع اور روایت کا انکار نہیں کیا جاسکتا، یہی امام مسلم اور ان کے علاوہ دیگر محدثین کا مذہب ہے، کیوں کہ وہ کسی روایت کی صحت کے لیے معاصرت کو کافی جانتے ہیں، بر خلاف امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے، ان کے نزدیک صحتِ حدیث کے لیے لقاء یعنی ملاقات شرط ہے۔

(۱) أخرجه البخاري (۳٤٥۱).

کے بارے میں، ملائکہ انبیاء، اولیاء اور ائمہ وغیرہ کے احوال کے بارے میں، اور اسی طرح مبدا و معاد کے بارے میں اسلام کے قانون کے مطابق تلاش و جستجو کی جائے، نا کہ حکما کے اصول کے مطابق، اور اس تلاش و جستجو کا مقصد یہ ہو کہ عقیدہ ایمانی میں درجہ یقین حاصل ہو جائے اور شبہات کا قلع قمع ہو سکے۔

اصول الدین کا ایک نام "علم کلام" بھی ہے۔ اور اس نام کی کئی وجوہات ہیں:

ایک وجہ یہ ہے کہ اس علم کے دامن میں موجود مسائل میں سے جس مسئلہ کے بارے میں سب سے زیادہ متکلمین نے کلام کیا ہے اور جس کے بارے میں سب سے زیادہ ان کے درمیان جنگ و جدال ہوا ہے وہ یہی صفتِ کلام کا مسئلہ ہے اس لیے اس ایک جزء کے نام پر کُل کا نام پڑ گیا۔

اس کی وجہ تسمیہ میں دوسرا قول یہ ہے کہ: اس علم کا نام "علم کلام" اس لیے ہے، کیوں کہ کلام کے کمال کا ظہور اس کے حقائق و دقائق کے بیان سے ہی عمل میں آتا ہے، جس پر مہارت اس علم کے حصول کے بغیر نہیں مل سکتی۔ اس لیے مبالغہ کی غرض سے بطورِ مجاز پورے علم کا نام ہی علم کلام رکھ دیا گیا۔

اس کی وجہ تسمیہ میں ایک تیسرا قول یہ بھی ہے کہ جب بھی اس زمانہ میں علماء سے اللہ کی صفات اور اس کے افعال کے متعلق کچھ پوچھا جاتا تو وہ جواب میں یہ جملہ کہتے: ہمیں اس کے بارے میں کلام کرنے سے منع کیا گیا ہے، پھر اس طرح سے اس نام کی شہرت ہو گئی اور دھیرے دھیرے یہ اس کے لیے بطورِ عَلم استعمال ہونے لگا۔

اور اگر "اصول الدین" کو مرکب اضافی ہونے کے لحاظ سے اس کے ہر جزء کو الگ کر کے دیکھیں:

تو "**اصل**" کا معنی ہے: جس پر اس کے غیر کی بنار کھی گئی ہو۔ اور "**دین**" کا معنی ہے: اللہ کے بنائے ہوئے وہ قوانین جو عقل والوں کو خیر کی طرف لے جائیں۔ اور انہیں قوانین کے مجموعے کا نام اسلام ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ﴾ [آل عمران: ۱۹] "بے شک اللہ کے نزدیک دین اسلام ہی ہے"۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ [مائدہ: ۳] "اور میں نے تمہارے لیے اسلام کو دین کے طور پر پسند کیا"۔

دین کا استعمال خضوع و طاعت اور جزاء و حساب کے معنی میں بھی ہوتا ہے لہذا اس معنی میں متدین اس شخص کو کہیں گے جس نے اسلام کے احکام کے آگے اپنی گردن جھکا کر اطاعت شعاری کا لبادہ پہن لیا ہو اور قیامت کے روز جزاء و حساب پر ایمان رکھتا ہو اور ایسا کرنے والا بندوں میں سب سے اچھا ہو گا۔

یہ عقیدہ ان اصول کا بیان ہے جن کو انہوں نے دین کے طور پر قبول کیا اور اس کی جزا رب العالمین سے طلب کی۔

"**رب**" کا معنی ہے مالک، اور "**العالمین**" عالم کی جمع ہے، جس سے مراد اہل عقل یعنی ملائکہ اور انس و جن ہیں۔ عالم کی تعریف میں ایک قول یہ بھی ہے کہ عالم اس مخلوق کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ خالق کا علم ہوتا ہے جیسے اجسام و اعراض کا مجموعہ۔ اس کا نام عالم اس لیے ہے کیوں کہ یہ صانع یعنی خالق کے ثبوت کی علامت ہے۔

***

الٰہیات

فصل

مسئلہ توحید

اللہ کی توفیق پر یقین رکھتے ہوئے چلیے اس کی وحدانیت کے بارے میں بات شروع کرتے ہیں:

بلاشبہ اللہ تعالی ایک ہے، جس کا کوئی شریک نہیں، نہ ہی اس کا کوئی مثل ہے، نہ ہی کوئی چیز اسے عاجز کر سکتی ہے اور نہ ہی اس کے سوا کوئی دوسرا معبود ہے۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے سب سے پہلے مسئلہ توحید کا ذکر اس لیے کیا کیوں کہ سب سے پہلا حکم جو مکلف کے حق میں واجب ہوتا ہے، وہ اسی توحید کے اقرار کا حکم ہے۔ اسی کے لیے تمام انبیاے کرام کی بعثت ہوئی اور اسی کا پیغام سنانے کے لیے تمام آسمانی کتابیں نازل ہوئیں۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَمَآ أَرۡسَلۡنَا مِن قَبۡلِكَ مِن رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِيٓ إِلَيۡهِ أَنَّهُۥ لَآ إِلَٰهَ إِلَّآ أَنَا۠ فَٱعۡبُدُونِ﴾ [انبیا:۲۵] "آپ سے پہلے جتنے بھی رسول ہم نے بھیجے ان کی طرف یہی وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں اس لیے میری ہی عبادت کرو"۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "**معتقدین**" جس کا معنی ہوتا ہے عقیدہ رکھتے ہوئے، جو کہ "**نقول**" میں موجود ضمیر سے حال ہے، معتقدین (عقیدہ رکھتے ہوئے) فرمانے کے پیچھے راز یہ ہے، تاکہ ایمان کا ثبوت اور تحقق ہو سکے؛ کیوں کہ دل سے اعتقاد کے بغیر صرف زبان سے اقرار کرنا ایمان نہیں کہلاتا، بلکہ یہ محض نفاق ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالی نے منافقین کے حال کی خبر دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: ﴿قَالُوٓاْ ءَامَنَّا بِأَفۡوَٰهِهِمۡ وَلَمۡ تُؤۡمِن قُلُوبُهُمۡ﴾

[المائدۃ:۴۱] "انہوں نے صرف اپنی زبانوں سے اقرار کیا کہ وہ ایمان لائے اور ان کے دل ایمان نہیں لائے"۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: "**بتوفیق اللہ**" یعنی اللہ کی توفیق سے۔ اس سے اہل سنت وجماعت کے اس عقیدے کی طرف اشارہ ہے کہ: عقیدہ وحدانیت کی سعادت محض ہدایتِ الٰہی سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿يَهْدِي ٱللَّهُ لِنُورِهِۦ مَن يَشَآءُ﴾ [النور:۳۵] "اللہ جسے چاہتا ہے اسے اپنے نور کی ہدایت دیتا ہے"۔ اس میں بندوں کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا جیسا کہ معتزلہ (۱) کا عقیدہ ہے۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: "إن الله واحد" یعنی بلاشبہ اللہ تعالی ایک ہے۔ یہ جملہ اور پوری کتاب میں اس کے بعد آنے والے سبھی جملے اسی "**نقول**" کی تفصیل ہیں، جو اس سے پہلے گزرا، یعنی: پورے اعتقاد ویقین کے ساتھ ہم کہتے ہیں: **بلاشبہ اللہ ایک ہے۔**

[واحد اور احد کے درمیان فرق:]

کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ واحد اور احد دونوں مترادف ہیں، قرآن میں دونوں ہی کا استعمال اللہ کے لیے ہوا ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿هُوَ ٱللَّهُ ٱلْوَٰحِدُ ٱلْقَهَّارُ﴾

---

(۱) یہ ایک کلامی فرقہ ہے، جو اموی دور کے آخر میں ظہور پذیر ہوا، اور بعض عباسی خلفا کے دوش کرم پر پراون چڑھا۔ اس فرقے کا بانی واصل بن عطا ہے، اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے گناہ کبیرہ کے مرتکب کے مسئلے میں یہ رائے قائم کی کہ وہ نہ تو مومن ہے اور نہ کافر، جس کے بعد اس نے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس سے "اعتزال" کر لیا یعنی ان کی مجلس سے الگ ہو کر اپنی الگ مجلس بنالی، یہیں سے ان کا نام معتزلہ پڑ گیا۔ اس فرقے کے بہت سے عقائد ہیں جو اہل سنت کے مخالف ہیں، کتاب میں آگے گاہے بگاہے آپ ان سبھی عقائد سے روشناس ہوں گے۔

وہ اللہ ہی ہے جو واحد بھی ہے اور قہار بھی"۔ دوسرے مقام پر ارشاد باری تعالیٰ [الزمر:۴] "وہ اللہ ہی ہے جو واحد بھی ہے اور قہار بھی"۔ دوسرے مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ﴾ [الاخلاص:۱] "آپ فرمادیجیے کہ اللہ ایک ہے"۔

جب کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ دونوں مترادف نہیں ہیں بلکہ دونوں کے معنی اور دونوں کے فائدے الگ الگ ہیں، کیوں کہ واحد کا استعمال صفات کے لیے ہوتا ہے اور احد کا استعمال ذات کے لیے۔ جیسا کہ اہل عرب کہتے ہیں: "فلانٌ واحِدُ زمانِه" یعنی "فلاں شخص اپنی مثال آپ ہے" اس جملہ سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص اپنی صفاتِ کمال میں تنہا ہے، کوئی ان صفات میں اس کا ساجھی نہیں ہے۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے: "إنَّ اللهَ تعالی أَحَدٌ في ذاتِه وواحِدٌ في صفاتِه"، "یقیناً اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں یکتا ہے اور اپنی صفات میں تنہا ہے"۔

ازہری [۱] نے فرمایا کہ جب واحد کا استعمال اللہ تعالیٰ کی صفت کے لیے کیا جائے تو اس کے دو معنی ہوتے ہیں: ایک یہ کہ وہ واحد ہے، اس کی کوئی نظیر نہیں اور نہ ہی اس کا کوئی مثل ہے۔ جیسا کہ اہل عرب اس شخص کے لیے جس کا پوری قوم میں کوئی مثل نہ ہو کہتے ہیں "فُلانٌ واحدُ قومِه" "فلاں اپنی قوم میں واحد و یکتا ہے۔ اور اس کا دوسرا معنی ہے کہ وہ ایک اکیلا معبود ہے اور اکیلا ہی مالک بھی، اس کی الوہیت و ربوبیت میں کوئی اس

---

(۱) ان کا پورا نام محمد بن احمد ابن الازہر الہروی، کنیت ابو منصور اور لقب ازہری ہے اور اسی لقب سے آپ نے شہرت بھی پائی۔ ان کا یہ لقب جامعۃ الازہر شریف کی طرف منسوب نہیں ہے، جیسا کہ بعض مبتدئین کا خیال ہے، بلکہ آپ کی یہ نسبت آپ کے دادا کی طرف ہے جن کا نام ازہر تھا۔ آپ خراسان کے شہر ہرات کے رہنے والے تھے۔ آپ کی متعدد تصانیف ہیں جن میں "تہذیب اللغۃ"، "تفسیر القرآن" اور "غریب الالفاظ التی استعملها الفقهاء" بہت مشہور ہیں۔ آپ کا سن وفات ۳۷۰ھ ہے۔

کا شریک نہیں۔

توحید کا مفہوم

ہمارے بعض اصحاب نے توحید کا معنی بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے: توحید کہتے ہیں کسی بھی شریک، قسیم اور شبیہ کی نفی کرنے کو۔ لہٰذا اللہ تعالی اپنے افعال میں تنہا ہے، کسی بھی چیز کو پیدا کرنے میں اس کا کوئی شریک نہیں، وہ اپنی ذات میں بھی یکتا ہے، اس کی ذات جیسا کوئی دوسرا نہیں اور اس میں کسی بھی ترکیب کا کوئی شائبہ نہیں۔ اور اسی طرح وہ اپنی صفات میں بھی ایک اکیلا ہے، مخلوق کی کسی صفت میں مخلوق کی طرح نہیں [اور اسی طرح کوئی مخلوق اس کی صفت میں اس کی طرح نہیں!]۔

توحید پر دلائل پیش کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالی کے وجود پر بھی تھوڑی بات کر لی جائے، اس کی معرفت واجب ہے یا نہیں، پھر یہ کہ اس معرفت تک وصول کیوں کر ممکن ہے، اس کے ذرائع وراستے کیا کیا ہیں؟ اس پر بھی تھوڑی روشنی پڑ جائے تو بہتر ہو گا۔

معرفت الٰہی کے واجب ہونے میں مذاہب کا اختلاف

معرفتِ الٰہی کے واجب ہونے میں مذاہب کا اختلاف ہے:

اس مسئلہ میں حشویہ [1] کا مذہب جو کہ نصوص کے ظاہری اور سطحی معنی کا اعتبار

(۱) امام سبکی نے "شرح اصول ابن الحاجب" میں فرمایا کہ "حشویہ" ایک گمراہ فرقہ ہے جو قرآنی آیات کو صرف ان کے ظاہر پر محمول کرتا ہے، اور ان کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ یہی ظاہری معنی مراد ہے۔ اور ان کے اس نام کے پیچھے یہ قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ حضرت حسن بصری کی مجلس میں بیٹھ کر اہل سنت والجماعت

کرتے ہیں، یہ ہے کہ اللہ تعالی کی معرفت واجب نہیں ہے، بلکہ جو صرف ظاہری نصوص سے ثابت ہے اس پر ظاہری عقیدہ رکھنا واجب ہے۔ اور اس مسئلہ میں جو لوگ عقلی دلائل سے استدلال کرتے ہیں ان کا یہ لوگ رد کرتے ہیں۔

لیکن جمہور مسلمین کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالی کی معرفت واجب ہے، لیکن ان کے درمیان اس کے حصول کے طریقہ کو لے کر اختلاف رہا ہے۔

اس سلسلے میں صوفیا اور اہلِ طریقت کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالی کی معرفت، ریاضت اور دل کی صفائی کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے، جس کے بعد لوحِ دل پر معرفت کے ایسے ایسے انوار و شواہد وارد ہوتے ہیں کہ عقل کی آنکھیں ان کو نہیں دیکھ سکتیں۔ اس تفصیل سے پتا چلتا ہے کہ معرفتِ الہی کے حصول کے باب میں وہ ذوق کو اپنا امام سمجھتے ہیں اور اسی پر اعتماد کرتے ہیں۔

اس باب میں ایک جماعت کا موقف یہ ہے کہ معرفت کا واحد ذریعہ الہام[1] ہے۔

اسماعیلی فرقے کی ایک شاخ "اہلِ تعلیم"[2] کا اس سلسلے میں یہ موقف ہے کہ امام

کے کسی عقیدے کے خلاف بات کر رہے تھے، تو آپ نے فرمایا: "رُدّوهولاء إلى حَشا الحلقةِ" "ان لوگوں کو حلقہ کے حاشیے یعنی مجلس کے آخر میں بٹھادو" پھر یہ لوگ اسی "حشا" کی طرف منسوب ہو کر "حشویہ" کے نام سے مشہور ہو گئے۔

(۱) الہام کا معنی ہے اللہ تعالی کی طرف سے بندے کے دل پر کسی بات کا نازل ہونا۔

(۲) امام ابو الحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "مقالات الاسلامیین" میں فرمایا کہ "اسماعیلیہ" رافضیوں کا سترھواں فرقہ ہے، جو کہ حضرت جعفر صادق کے بڑے بیٹے حضرت اسماعیل کی طرف منسوب ہے، ان کے نزدیک حضرت جعفر صادق کے بعد جو امام ہیں وہ حضرت اسماعیل ہیں، اور وہ اس بات کا انکار کرتے ہیں کہ ان کی وفات ان کے والد حضرت جعفر کی زندگی میں ہی ہو گئی تھی۔

معصوم کی راہ نمائی کے بغیر معرفتِ الٰہی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے ان کا عقیدہ ہے کہ اللہ پر امام کا نصب کرنا واجب ہے اور یہ کہ کسی بھی زمانے کا کسی ایسے معصوم امام سے خالی ہونا محال ہے، جو مخلوق کو معرفتِ الٰہی کی راہ دکھائے۔

اور جمہور متکلمین کا موقف یہ ہے کہ اللہ کی معرفت کا واحد ذریعہ، فکر و نظر اور استدلال و استنباط ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالی کے وجود کا علم بدیہی نہیں، بلکہ نظری ہے جس کے لیے کسی دلیل کی ضرورت پڑتی ہے اور رہی وہ دلیلِ نقلی جو کتاب و سنت سے ماخوذ ہے، اس کا ثبوت تو اس وقت معتبر ہو گا جب پہلے قرآن و سنت اور نبوت کی صحت کا دعوی ثابت ہو جائے، جس سے پتا چلا کہ دلائل نقلیہ فرع ہیں ان دلائل عقلیہ کی جن کے ذریعہ قرآن و سنت کی صحت کا ثبوت ہوتا ہے، اس لیے اصول میں ان دلائل نقلیہ سے استدلال کرنا ممکن نہیں تھا، جس کی وجہ سے معرفتِ الٰہی کے حصول کے لیے اب ان کے سامنے ایک ہی طریقہ بچا تھا اور وہ تھا دلائلِ عقلیہ کا طریقہ، جس کی تائید میں خود قرآن کریم میں دلیلیں وارد ہوئی ہیں۔

لہذا وجودِ الٰہی پر یا تو امکانِ عالم سے استدلال کیا جائے گا، یا اس کے حدوث سے، یا پھر دونوں سے؛ کچھ بھی ہو یہ عالم یا تو جواہر کی شکل میں ہو گا یا پھر اعراض کی شکل میں:

وجودِ باری تعالی پر ذوات کے امکان کو دلیل بنانے کی طرف، ہی اللہ رب العزت کے

اور اہلِ تعلیم یا پھر "تعلیمیہ" کے سلسلے میں امام شہرستانی نے اپنی کتاب "الملل والنحل" میں ارشاد فرمایا کہ اسماعیلی شیعہ الگ الگ علاقوں میں الگ الگ ناموں سے جانے جاتے ہیں، جن میں ان کا سب سے مشہور لقب "باطنیہ" ہے، اس کے علاوہ عراق میں انہیں باطنیہ، قرامطہ اور مزدکیہ کہا جاتا ہے، خراسان میں تعلیمیہ اور ملحدہ کہا جاتا ہے۔

اس فرمان میں اشارہ کیا گیا ہے: ﴿وَٱللَّهُ ٱلْغَنِيُّ وَأَنتُمُ ٱلْفُقَرَآءُ﴾ [محمد:۳۸] "اور اللہ بے نیاز ہے اور تم سب محتاج ہو" کیوں کہ "ممکن" اپنے وجود میں کسی ایسے شخص کا محتاج ہوتا ہے، جو اس کو وجود بخشے اور "واجب" اپنے وجود میں ہر ایک سے بے نیاز ہوتا ہے۔ وجود باری تعالی پر ذوات کے حدوث کو دلیل بنانے کی طرف قرآن میں ذکر کردہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس قصے میں اشارہ ملتا ہے: ﴿لَآ أُحِبُّ ٱلْأَفِلِينَ﴾ [الانعام:۷۶] "میں ڈوب جانے والوں کو پسند نہیں کرتا"۔ یہ طریقہ عوام کو سمجھانے کے لیے سب سے اچھا طریقہ ہے، اگر باریک بینی سے دیکھیے تو اس طریقے میں دو طرح کے دلائل ہیں: کچھ دلائل تو وہ ہیں جو خود انسان کی اپنی ذات میں موجود ہیں، اور کچھ دوسرے دلائل وہ ہیں جو اس عالم کے ذرے ذرے میں موجود ہیں، دلائل کی انہیں دونوں قسموں کی طرف اللہ تعالی کے اس فرمان میں اشارہ موجود ہے: ﴿سَنُرِيهِمْ ءَايَٰتِنَا فِى ٱلْآفَاقِ وَفِىٓ أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ ٱلْحَقُّ﴾ [فصلت:۵۳] عنقریب ہم انہیں آفاق میں اور خود ان کی ذات میں موجود اپنی نشانیاں دکھائیں گے تاکہ ان کے سامنے یہ واضح ہو جائے کہ وہ حق ہے۔

ذات میں موجود دلائل: ہم میں سے ہر شخص کو یہ بات معلوم ہے کہ وہ پہلے نہیں تھا، پھر ہوا۔ اور جو بھی عدم کے بعد وجود میں آئے اس کے لیے ایک موجِد یعنی وجود دینے والے کا ہونا ضروری ہے اور ظاہر ہے یہ موجِد خود اس کی اپنی ذات نہیں ہو سکتی، نہ اس کے والدین ہو سکتے ہیں اور نہ ہی مخلوق میں سے کوئی ہو سکتا ہے، کیوں کہ اس طرح کی ترکیب، اس شان کی کاریگری، ان کے بس کی بات تو نہیں ہے، یہ بات ہم اور آپ، سب جانتے

ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ اس کے ایجاد کے لیے ایک ایسا صانع اور بنانے والا ہونا ضروری ہے، جس کی نہ کوئی ابتدا ہو اور نہ انتہا، اور ان موجودات کا کوئی بھی عنصر، کوئی بھی صفت اس کی ذات میں شامل نہ ہو، وہ سب سے جدا، سب سے الگ ہو۔

آفاقِ عالم میں موجود دلائل: یہ بات ہم سب کو معلوم ہے کہ اس عالم میں تغیر و تبدیلی ہوتی رہتی ہے، جس کا اس بات میں ذرا بھی شک ہو وہ خود اپنے مشاہدے سے اس حقیقت کو جان سکتا ہے: موسم کی رتیں بدلتی رہتی ہیں، رات، دن میں بدل جاتی ہے اور دن، رات میں، کبھی چاند ہوتا ہے تو سورج نہیں اور کبھی سورج ہوتا ہے تو چاند نہیں، کبھی آسمان گڑگڑاتے ہیں اور کبھی بجلی کڑکتی ہے، کبھی بادل چھاتے ہیں اور کبھی مینہ برستا ہے، اس کے علاوہ بھی بہت کچھ اس میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ جب عالم کی تبدیلی کا یقین آگیا تو یہ بات بھی معلوم ہونی چاہیے کہ جس بھی چیز میں تغیر و تبدیلی ہو، وہ چیز حادث ہو گی، اور جو حادث ہو، اس کے لیے ایک محدث یعنی عدم کا لباس اتار کر وجود کا جامہ پہنانے والے کا ہونا ضروری ہے، جس کی صفت یہ ہو کہ وہ قدیم ہو، کیوں کہ اگر وہ حادث ہو گا تو وہ بھی اسی طرح دوسرے کسی محدِث کا محتاج ہو گا، اس صورت میں یا تو "دور" لازم آئے گا یا پھر "تسلسل" اور یہ دونوں ہی اپنے آپ میں محال ہیں۔

وجودِ باری تعالیٰ پر انبیاء علیہم السلام اور ان کے علاوہ متقدمین علما اور اہلِ عقل کا یہی طریقہ استدلال رہا ہے، چناں چہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی ملائکہ پر فضیلت کی حجت اس طرح قائم کی کہ صرف ان کا علم ملائکہ پر ظاہر فرما دیا، اور یہی [عملی] استدلال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں خبر دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: ﴿قَالَ يَٰقَوْمِ أَرَءَيْتُمْ إِن كُنتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي وَءَاتَىٰنِي رَحْمَةً مِّنْ عِندِهِۦ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ

﴿أَنُلْزِمُكُمُوهَا وَأَنتُمْ لَهَا كَٰرِهُونَ﴾ [ھود:۲۸] "بولا اے میری قوم بھلا بتاؤ تو اگر میں اپنے رب کی طرف سے روشن دلیل پر ہوں اور اس نے مجھے اپنے پاس سے رحمت بخشی، تو تم اس سے اندھے رہے کیا ہم اسے تمہارے گلے ڈال دیں گے اور تم بیزار ہو؟" اور ان کی قوم کے بارے میں خبر دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: ﴿قَالُوا۟ يَٰنُوحُ قَدْ جَٰدَلْتَنَا فَأَكْثَرْتَ جِدَٰلَنَا﴾ [ھود:۳۲] "انہوں نے کہا اے نوح! تم نے ہم سے جدال کیا اور بہت زیادہ جدال کیا"۔ اور ظاہر ہے کہ یہ فروع میں نہیں تھا بلکہ دلائل قطعیہ کے ذریعہ توحید و نبوت اور معرفتِ حق جیسے اصول میں تھا۔

مطلب
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی میں توحید کے مناظر

پہلا منظر: خود اپنی ذات کے ساتھ ان کا خطاب: ﴿فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ ٱلَّيْلُ رَءَا كَوْكَبًا ۖ قَالَ هَٰذَا رَبِّى ۖ فَلَمَّآ أَفَلَ قَالَ لَآ أُحِبُّ ٱلْءَافِلِينَ﴾ [انعام:۷۶] "تو جب رات کی سیاہی چھا گئی، پھر اس نے ایک ستارہ دیکھا، کہا: یہ ہے میرا رب، پھر جب وہ ڈوب گیا تو کہا میں ڈوبنے والے کو (رب بنانا) پسند نہیں کرتا"۔ کسی چیز کے تغیر و تبدل سے اس کے حادث ہونے پر استدلال کرنا، یہی متکلمین کا طریقہ ہے۔ اس استدلال پر اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف فرمائی، ارشاد باری تعالیٰ ہے: "﴿وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ ءَاتَيْنَٰهَآ إِبْرَٰهِيمَ عَلَىٰ قَوْمِهِۦ﴾ [انعام:۸۳] "یہ تھی ہماری حجت جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے خلاف سکھائی تھی۔

دوسرا منظر: اپنے والد کے ساتھ ان کا خطاب: ﴿يَٰٓأَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنكَ شَيْـًٔا﴾ [مریم:۴۲] "اے میرے والد آپ اس کی پرستش کیوں کرتے ہیں جو نہ تو سن سکتا ہے، نہ دیکھ سکتا ہے، اور نہ ہی آپ کو کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے۔

تیسرا منظر: عملی وقولی دونوں طریقوں سے اپنی قوم کے ساتھ ان کا خطاب: ﴿فَجَعَلَهُمْ جُذَٰذًا إِلَّا كَبِيرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ إِلَيْهِ يَرْجِعُونَ﴾ [انبیاء:۵۸] "تو اس نے ان (بتوں) کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور ان میں سب سے بڑے بت کو ان کے لیے (چھوڑ دیا) تاکہ وہ اس کی طرف رجوع کریں"۔

چوتھا منظر: اپنے زمانہ کے بادشاہ نُمروذ[1] کے ساتھ ان کا خطاب: ﴿رَبِّيَ ٱلَّذِي يُحْيِۦ وَيُمِيتُ﴾ [البقرہ:۲۵۸] "میرا رب وہ ہے جو زندگی اور موت دیتا ہے"۔ آپ نے یہاں پر ان افعال کے ذریعہ ربوبیت پر استدلال کیا جن کے کرنے سے ایک رب کے سوا سبھی لوگ عاجز رہ جائیں۔ جیسے زندگی عطا کرنا، موت دینا اور سورج کو مشرق سے نکالنا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اکثر جگہوں پر ابراہیم علیہ السلام کے مذکورہ انہیں دلائل کا سہارا لیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے "سورہ طٰہٰ" میں موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ﴿قَالَ فَمَن رَّبُّكُمَا يَٰمُوسَىٰ قَالَ رَبُّنَا ٱلَّذِيٓ أَعْطَىٰ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُۥ ثُمَّ هَدَىٰ﴾ [طٰہٰ:۴۹، ۵۰] "اس نے پوچھا: اے موسیٰ! تم دونوں کا رب کون ہے؟ اس نے جواب دیا: ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی صورت دی، پھر راہ دکھائی"۔ بعینہ اسی

---

(۱) جو اہل اردو کے یہاں "نمرود" کے نام سے مشہور ہے۔

دلیل کا ذکر ابراہیم علیہ السلام کے اس قول میں موجود ہے: ﴿ٱلَّذِى خَلَقَنِى فَهُوَ يَهْدِينِ﴾ [شعراء:۷۸] جس نے مجھے پیدا کیا، وہی مجھے ہدایت عطا کرے گا"۔ سورہ شعراء میں ان کی زبانی اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا: ﴿رَبُّكُمْ وَرَبُّ ءَابَآئِكُمُ ٱلْأَوَّلِينَ﴾ [شعراء:۲۶] "وہ تمہارا اور تم سے پہلے تمہارے آباء واجداد کا رب ہے"۔ اسی کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی زبان میں فرمایا: ﴿رَبِّىَ ٱلَّذِى يُحْىِۦ وَيُمِيتُ﴾ [بقرہ:۲۵۸] "میرا رب وہ ہے جو زندگی اور موت دیتا ہے"۔ جب اس نے یہ دلیل بھی سنی ان سنی کر دی، اور اس کے تکبر نے کسی تیسری دلیل کا مطالبہ کیا، تو اس پر حضرت موسی علیہ السلام نے اس سے فرمایا: ﴿رَبُّ ٱلْمَشْرِقِ وَٱلْمَغْرِبِ﴾ [شعراء:۲۸] "وہ مشرق و مغرب کا پروردگار ہے" یہی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی فرمایا تھا: ﴿فَإِنَّ ٱللَّهَ يَأْتِى بِٱلشَّمْسِ مِنَ ٱلْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ ٱلْمَغْرِبِ﴾ [بقرہ:۲۵۸] "بے شک اللہ تعالی مشرق سے سورج نکالتا ہے، تو تم مغرب سے اسے نکال کر دکھاؤ۔

اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھیں، تو توحید و نبوت اور حشر و آخرت پر ان کے ذریعے دیے گئے دلائل تو اتنے زیادہ ہیں کہ محتاج ذکر نہیں، ان کا ذکر قرآن کریم میں جابجا دیکھنے کو ملتا ہے۔

ارشاد باری تعالی ہے: ﴿ٱدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِٱلْحِكْمَةِ وَٱلْمَوْعِظَةِ ٱلْحَسَنَةِ وَجَٰدِلْهُم بِٱلَّتِى هِىَ أَحْسَنُ﴾ [نحل:۱۲۵] "اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت اور اچھی گفتگو کے ذریعہ دعوت دیجیے اور ان سے اس (طریقے) سے جدال کیجیے، جو احسن ہے"۔ بلا شبہ یہاں پر "حکمت" سے مراد دلیل اور حجت ہے۔ اس لیے دعوت دین، دلائل و براہین کی روشنی میں دینے کا حکم ہے۔ اور ﴿وَجَٰدِلْهُم بِٱلَّتِى هِىَ أَحْسَنُ﴾ [نحل:۱۲۵] "ان

سے اس طریقے سے جدال کیجیے جو احسن ہے"۔ میں جدال سے مراد، فروعات میں جدال کرنا نہیں ہے، کیوں کہ وہ لوگ اصل شریعت کے ہی منکر تھے، جس سے پتا چلا کہ اس سے مراد توحید و نبوت جیسے اصول میں جدال ہے۔

ارشاد باری تعالی ہے:﴿وَمِنَ ٱلنَّاسِ مَن يُجَـٰدِلُ فِي ٱللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ [حج:٣] "کچھ لوگ وہ ہیں جو اللہ کے بارے میں بغیر جانے جدال کرتے ہیں"۔ اس کا مطلب ہے کہ کسی کے بارے میں علم رکھنے کے بعد جدال کرنا مذموم نہیں بلکہ وہ تو ممدوح ہے، اسی لیے اللہ تعالی ہمیں غور و فکر کرنے کا حکم دیتا ہے، ارشاد باری تعالی ہے:﴿قُلِ ٱنظُرُواْ مَاذَا فِي ٱلسَّمَـٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ﴾ [یونس:١٠١] "آپ فرما دیجیے! نظر دوڑا کر دیکھو، آسمانوں اور زمین میں کیا ہے۔﴿أَوَلَمْ يَنظُرُواْ فِي مَلَكُوتِ ٱلسَّمَـٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ﴾ [اعراف: ١٨٥]" کیا انہوں نے آسمانوں اور زمین میں غور نہیں کیا۔

فکر و نظر اور تدبر و تفکر کو قرآن میں مدح کے مقام پر ذکر فرمایا ہے، ارشاد باری تعالی ہے:﴿إِنَّ فِي خَلْقِ ٱلسَّمَـٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَٱخْتِلَـٰفِ ٱلَّيْلِ وَٱلنَّهَارِ لَـَٔايَـٰتٍ لِّأُوْلِي ٱلْأَلْبَـٰبِ﴾ [آل عمران:١٩٠] "یقیناً آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات و دن کے بدلنے میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں"۔ ارشاد باری تعالی ہے:﴿إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُوْلِي ٱلْأَبْصَـٰرِ﴾ [نور:٤٤] "بلاشبہ اس میں اہل نظر کے لیے عبرت ہے۔

اور نشانیوں سے آنکھ بند کر لینے کو مذموم قرار دیا گیا ہے، ارشاد باری تعالی ہے:﴿وَكَأَيِّن مِّنْ ءَايَةٍ فِي ٱلسَّمَـٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا

مُعۡرِضُونَ﴾ [یوسف:۱۰۵] "آسمانوں اور زمین میں کتنی ایسی نشانیاں ہیں جن سے آنکھ بند کر کے وہ گزر جاتے ہیں"۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿لَهُمۡ قُلُوبٌ لَّا يَفۡقَهُونَ بِهَا﴾ [اعراف:۱۷۹] "ان کے پاس ایسے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں ہیں"۔

یہاں تک کہ اللہ تعالی نے اندھی تقلید کی مذمت فرمائی ہے، چنانچہ کفار کا قول نقل کرتے ہوئے اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا: ﴿بَلۡ قَالُوٓاْ إِنَّا وَجَدۡنَآ ءَابَآءَنَا عَلَىٰٓ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰٓ ءَاثَٰرِهِم مُّهۡتَدُونَ﴾ [زخرف:۲۲] " ہم نے اپنے آباء واجداد کو اسی دین پر پایا ہے اور ہم انہیں کے نقش قدم پر چلیں گے"۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: ﴿بَلۡ نَتَّبِعُ مَآ أَلۡفَيۡنَا عَلَيۡهِ ءَابَآءَنَآ﴾ [بقرہ:۱۷۰] "بلکہ ہم اسی (دین) کی اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا"۔ یہ سب آیات اس بات کی شاہد ہیں کہ فکر و تدبر واجب ہے اور اندھی تقلید قابلِ مذمت ہے۔

ان سب دلائل کو پیش کرنے کا مقصد، حشویہ کے اس نظریہ کی تردید کرنا ہے کہ "اصول الدین" یعنی "علم کلام" میں مشغول ہونا مذموم ہے، حالاں کہ اصول الدین نام ہی ہے ان دلائل کو مضبوطی سے تھام کر ان پر ہونے والے شبہات کے رد کرنے کا۔ اور یہی معصوم انبیاے کرام کا طریقہ ہے، جب کہ اندھی تقلید ان کفار کا طریقہ ہے، ذلت ورُسوائی جن کا مقدر بنا۔

[علمِ کلام کی فضیلت:]

کسی بھی علم کا شرف اس میں پائی جانے والی معلومات سے طے ہوتا ہے۔ جس طرح سے اللہ تعالی کی ذات وصفات اشرف المعلومات ہیں، اس کے سامنے ہر شرف ہیچ ہے، اسی

طرح سے وہ علم جس میں اس ذات بابرکات اور ان سُتودہ صفات کے بارے میں گفتگو کی جائے، وہ علم بھی اشرف العلوم ہو گا۔ چوں کہ یہ شرف "علم کلام" کے حصے میں آیا، اسی لیے وہ اشرف العلوم کہلایا۔

اس علم کے اشرف العلوم ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ علم دو طرح کا ہوتا ہے ایک دینی دوسرا غیر دینی۔ دینی علم غیر دینی علم سے اشرف واعلیٰ ہے۔ اور اس دینی علم کی بھی دو قسمیں ہیں: "اصول الدین"[1] "غیر اصول الدین" اور غیر اصول الدین میں جتنے بھی علوم آتے ہیں وہ سب اُسی پر موقوف ہیں، اب خواہ وہ علم تفسیر ہو، کیوں کہ مفسر کا کام کلامِ الٰہی کے معانی میں بحث وجستجو کرنا ہے اور اس کے لیے پہلے اس صانع کے وجود کو ثابت کرنا ہو گا جو کہ مختار ہو اور متکلم بھی ہو اور یہ صرف علم اصول الدین کے ذریعہ ہی ثابت کیا جاسکتا ہے۔ خواہ علمِ حدیث ہو، کیوں کہ ایک محدث کا مطمح نظر نبی ﷺ کی احادیث ہوتی ہیں، اور ظاہر ہے کہ ان احادیث کو ایک انسان اسی وقت دل سے مانے گا جب اس کا آقا ﷺ کی نبوت کی سچائی پر سچا ایمان ہو گا، اور پھر نبوت کا ثبوت بھی اصول الدین کے فہم وادراک پر ہی موقوف ہے۔ اور خواہ وہ علمِ فقہ ہو، کیوں کہ ایک فقیہ احکام الٰہی کی تلاش وجستجو کرتا ہے، جس کے لیے پہلے توحید ونبوت کی حقیقت وصداقت پر دلائل قائم کرنے ہوں گے، ورنہ کوئی کیوں کر مانے گا کہ یہ احکامِ الٰہی ہی ہیں!؟ ان تمام چیزوں سے یہ بات تو واضح ہو گئی کہ یہ تمام علوم، اصول الدین کے محتاج ہیں اور وہ ان سب سے بے نیاز ہے۔ احتیاج وغنا کی اسی کہانی نے اسے اشرف العلوم بنا دیا۔ تمام علوم پر اس علم کے ترجیح

---

(۱) علوم اصلیہ پانچ ہیں: علم کلام، علوم قرآن، علوم حدیث، فقہ، تصوف۔ اور ان کے علاوہ جو دیگر علوم ہیں جیسے نحو، صرف، منطق، اصول الفقہ وغیرہ یہ سب علوم، علومِ آلہ کہلاتے ہیں۔

کی وجوہات اور بھی بہت سی ہیں، جنہیں اس مختصر سی کتاب میں ذکر کرنا مناسب نہیں ہے۔

یہاں پر چلیے تھوڑی دیر رک کر اسلاف کی ان سادہ اور عام سی باتوں کا بھی ذکر کرلیتے ہیں، جن کے ذریعہ وہ منکرین کولاجواب کردیا کرتے تھے:

روایت میں آیا ہے کہ کسی زندیق [1] نے حضرت جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے خالق کا انکار کیا۔ اس پر آپ نے اس سے سوال کیا: کیا کبھی تمہارا سمندر میں سوار ہونے اور اس کی ہولناکیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے؟ اس نے جواب دیا: جی ہاں! ایک بار میں سمندر میں کشتی پر بیٹھا تھا، اتنے میں تند و تیز ہوائیں چلنے لگیں، جن سے کشتی پارہ پارہ ہوگئی، اور اس کے سارے ملّاح ڈوب گئے، لیکن میں نے ایک تختے کو مضبوطی سے تھام لیا اور موجوں کے تلاطم کے بیچ اسی کے سہارے آگے بڑھتا رہا اور آخر کار ساحل تک پہنچ گیا۔ یہ سن کر آپ نے اس سے دوسرا سوال کیا: کیا اس دوران تم یہ امید رکھتے تھے کہ بچ کر صحیح سالم نکل جاؤگے؟ اس نے جواب دیا: جی ہاں! اس پر آپ نے اس سے فرمایا: آخر کس سے امید رکھتے تھے؟ یہ سن کر وہ بالکل خاموش ہوگیا۔ اس کے بعد آپ نے اس سے فرمایا: وہ خالق ہی تھا جس کی ذات سے اس وقت تمہاری ساری امیدیں بندھی تھیں اور اسی نے تمہیں ڈوبنے سے بچایا ہے۔ یہ سن کر وہ ان کے ہاتھ پر ایمان لے آیا۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ دہریوں [2] کے لیے تیز ترار تلوار تھے۔ وہ لوگ ہمیشہ ان کو قتل

---

(۱) زندیق وہ شخص ہے جس کی زبان پر اسلام رہے، لیکن باطن میں کفر چھپا ہو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اسی کو منافق کہا جاتا تھا۔

(۲) دہریہ: کفار کا ایک فرقہ ہے، جو دہر یعنی زمانے کے قدیم ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں، اور جتنی بھی چیزیں وجود میں آتی ہیں ان کا خالق وہ زمانے کو ہی مانتے ہیں۔ ارشاد باری تعالی ہے: "﴿وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا

کرنے کا موقع ڈھونڈھا کرتے تھے۔ ایک بار وہ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے، اس موقع سے فائدہ اٹھا کر وہ انہیں قتل کرنے کی خاطر ننگی تلواریں لے کر ان پر ٹوٹ پڑے۔ ان کے اس ارادہ کو بھانپ کر آپ نے ان سے فرمایا: پہلے میرے ایک سوال کا جواب دے دو اس کے بعد تمہارے دل میں جو آئے کرنا۔ اس بات پر وہ راضی ہو گئے اور کہا: پوچھیے جو پوچھنا چاہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: اگر تم سے کوئی یہ کہے کہ میں نے سمندر کے بیچ و بیچ ایک ایسی کشتی دیکھی، جو مال و متاع سے بھری ہوئی تھی اور لوگوں کا بھی ایک جم غفیر اس پر سوار تھا، جہاں ایک طرف موجوں کا تلاطم اسے اپنی چپیٹ میں لینے کے لیے شوریدہ خاطر تھا وہیں دوسری طرف مخالف ہوائیں اسے اپنا شکار بنانے کے لیے مچل مچل کر اس کی طرف بڑھ رہی تھیں، لیکن وہ نازک جان ان سب کے بیچ آسانی سے آگے کی طرف بہی چلی جارہی تھی اور مزے کی بات تو یہ کہ اس میں کوئی ملّاح بھی موجود نہیں تھا۔ اس قائل کے بارے میں جو بات تمہارے ذہن میں سب سے پہلے آئے گی وہ کیا ہوگی؟ کیا یہ عقل میں سمانے والی بات ہے!؟ ان لوگوں نے بیک زبان کہا: نہیں، واقعی میں یہ عقل میں آنے والی بات تو نہیں ہے۔ اس پر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: سبحان اللہ! جب ایک ادنی سی کشتی بغیر ملاح کے نہیں چل سکتی تو تحت الثری کی پستیوں سے لے کر عرش کی بلندیوں تک پھیلا ہوا اتنا بڑا وسیع و عریض یہ عالم، جس میں کاریگری کی بے شمار بو قلمونیاں شامل ہیں کیا بغیر کسی رچنے والے کے خود بخود وجود میں آسکتا ہے!؟ یہ سن کر وہ سب رو پڑے اور آپ کے ہاتھ پر سب کے سب ایمان لے آئے۔

الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ وَمَا لَهُمْ بِذَلِكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ﴾" [جاثیہ: ۲۴] اور انہوں نے کہا وہ تو نہیں مگر یہی ہماری دنیا کی زندگی، مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہمیں صرف اور صرف زمانہ ہلاک کرتا ہے اور اُنہیں اس کا علم نہیں، وہ تو صرف گمان لگاتے ہیں۔

کسی حکیم نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا: ذرا بتایئے کیا خالق کے وجود پر کوئی دلیل بھی ہے!؟ آپ نے ان سے فرمایا: اگر اس پر تمھیں کوئی دلیل چاہیے تو شہتوت کے پتہ کو دیکھ لو، ان سب کا ذائقہ، ان کی بو، ان کا رنگ، سب ایک طرح کا ہوتا ہے۔ حکیم صاحب نے کہا: جی ہوتا تو ایک ہی طرح کا ہے۔ اس پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے فرمایا: اب ذرا اس میں تھوڑی دیر غور کرو! انھیں ریشم کا کیڑا کھاتا ہے تو اس سے ریشم نکلتا ہے، انھیں کو شہد کی مکھی چوستی ہے تو ان سے شہد نکلتا ہے، بکری کھاتی ہے تو ان سے مینگنیاں نکلتی ہیں اور اگر انھیں کو ہرن کھالے تو اس کی ناف میں مشک اتر آتا ہے! آخر وہ کون سی ذات ہے جس نے ایک ہی چیز سے، جس کی طبیعت بھی ایک ہے، اس طرح کی گونا گوں چیزیں پیدا کر دیں!؟ یہ سن کر ان کا دل پگھل گیا اور وہ سچے دل سے توبہ کر کے ان کے ہاتھ پر ایمان لے آئے۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے وجود باری تعالیٰ پر کچھ اس انوکھے انداز میں استدلال کیا: ایک قلعہ ہے، جس کے دروازے ہر طرف سے مسدود ہیں اور دیکھنے میں وہ بالکل چکنا ہے، اس کا بیرونی حصہ پگھلی ہوئی چاندی کے مثل ہے اور اندرونی حصہ خالص کھرے سونے کے مانند ہے، پھر اس کی دیواریں پھٹتی ہیں اور اس کے اندر سے ایک ننھی سی جان نکلتی ہے، جو سنتی بھی ہے اور دیکھتی بھی ہے۔ اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ "کوئی تو ہے جو نظام ہستی چلا رہا ہے، وہی خدا ہے، وہی خدا ہے!" قلعہ سے ان کی مراد انڈا ہے اور جان سے مراد چوزہ ہے۔

حضرت ہارون رشید نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے اس بارے میں سوال کیا تو آپ نے اس پر آوازوں کے اختلاف، نغمات کی نیرنگیوں اور زبانوں کی بوقلمونیوں سے استدلال کیا۔

اسی کے بارے میں جب شاعر ابو نواس سے پوچھا گیا، توانہوں نے اس کے جواب میں یہ اشعار کہے:

زمیں کے سینہ پر اگنے والے سبزے میں غور کرو
اور مالک کے بنائے ہوئے آثار پر نظر دوڑاؤ
جو زَبَرجد کی بل کھاتی شاخوں پر جھوم جھوم کر یہ گواہی
دے رہے ہیں کہ اس کا کوئی شریک نہیں

ایک اعرابی سے وجود باری تعالی کے بارے میں سوال کیا گیا تو اس نے جواباً یہ دلیل دی: کسی سنسان صحرا میں پڑی بیٹ یہ بتاتی ہیں کہ یہاں پر کچھ دیر پہلے کسی اونٹ کا گزر ہوا ہے، کہیں پر پڑی لید کو دیکھ کر کسی گدھے کے وجود کا احساس ہوتا ہے، نشاناتِ قدم کسی گزرنے والے کا پتہ دیتے ہیں؛ تو پھر برجوں کو محیط یہ آسمان، پہاڑوں سے لدی ہوئی یہ زمین، موجیں مارتا ہوا یہ سمندر، چیخ چیخ کر کیا کسی ایسی ذات کے ہونے کا اعلان نہیں کرتے، جو علیم بھی ہو اور قدیر بھی۔

کسی طبیب سے پوچھا گیا کہ آپ نے اپنے رب کو کیسے پہچانا؟ توانہوں نے جواب دیا: ھلیلج (یعنی: ہڑ) کے ذریعہ! سوکھی ہلیلج کھاؤ تو وہ قبض کو ختم کرتی ہے اور اگر اس کا عرق پیو تو وہ قبض کرتا ہے۔

ایک دوسرے طبیب سے یہی سوال کیا گیا تو اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا: میں نے اس کو شہد کی مکھی کے ذریعہ پہچانا، ایک ڈنک سے شہد نکالتی ہے، اور دوسرے سے ڈستی ہے حالانکہ شہد اور ڈنک ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

وحدانیت کی دلیل

آیئے اب اصل مقصد یعنی توحید کی دلیل کی طرف لوٹ کر چلتے ہیں اس کی دلیل کچھ اس طرح ہے: عالم کا بنانے والا ایک ہے، کیوں کہ اگر دو ہوتے تو دونوں کے درمیان تمانع یعنی ٹکراؤ لازم آتا، جو کہ دونوں کی یا دونوں میں سے ایک کے حادث ہونے کی دلیل ہے۔ اس لیے کہ دونوں میں سے ایک اگر کسی شخص کو زندگی دینا چاہے اور دوسرا اسی کو موت دینا چاہے، تو اب ایسی صورت میں اگر دونوں کی مراد پوری ہو جائے، تو یہ ایک جگہ پر دو متضاد چیزوں کا اجتماع ہے، جو کہ محال ہے، یا پھر اس کی دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ان میں سے صرف ایک کی مراد پوری ہو اور دوسرے کی نہ ہو، تو جس کی مراد پوری نہ ہو وہ اس کے عجز کی علامت ہو گی اور جو عاجز ہو بھلا وہ معبود کیوں کر ہو سکتا ہے !؟ اسی کو "علمِ کلام" کی اصطلاح میں "دلیل التمانع" یعنی ٹکراؤ والی دلیل کہتے ہیں، جو کہ اس آیت سے ماخوذ ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿لَوْ كَانَ فِيهِمَآ ءَالِهَةٌ إِلَّا ٱللَّهُ لَفَسَدَتَا﴾ [انبیاء: ۲۲] "اگر زمین و آسمان میں اللہ کے سوا اور کوئی معبود ہوتا تو یقینا اس میں فساد بپا ہو جاتا"۔

اس کا کوئی شریک نہیں۔

اس عبارت میں شرک کی نفی سے مقصود اس کی تمام قسموں کی نفی کرنا ہے، کیوں کہ لغت میں اشتراک کا معنی ہے، مساوات و برابری۔ اب یہ برابری یا تو ذات میں ہو گی، جیسا کہ "ثنویہ" یعنی دو خدا ماننے والوں نے ٹھہرائی، کیوں کہ ان کے نزدیک اس عالم کے دو خالق ہیں، ایک بھلائی کا خالق، جس کو وہ یزداں کہتے ہیں اور دوسرا شر کا خالق، جس کو وہ

اہر من کہتے ہیں۔ اور اسی سے ملتا جلتا [بلکہ اس سے کئی ہاتھ آگے بڑھ کر] "طبائعی "[1] اور "افلاکی "[2] لوگوں کا عقیدہ ہے۔

یا یہ برابری اس کے سوا کسی دوسرے کی عبادت کرنے اور پھر اس کو معبود کہنے میں ہوگی، جیسا کہ مشرکین عرب نے کیا، کیوں کہ اللہ تعالی کے ساتھ ساتھ انہوں نے بتوں کی بھی پرستش کی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ انہیں معبود بھی کہا۔ اس لیے اللہ کے خالق ہونے کا اقرار کرنے کے باوجود وہ مشرک ہی ٹھہرے، کیوں کہ انہوں نے غیر اللہ کی بھی عبادت کی تھی۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ﴾ [لقمان:۲۵] "اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان وزمین کو کس نے پیدا کیا تو وہ ضرور بولیں گے کہ اللہ نے"۔

اور یا پھر یہ برابری کسی صفت میں ہوگی جیسا کہ "اہل تجسیم "[3] کا عقیدہ ہے، انہوں نے اللہ تعالی کو شکل وصورت، جسم وجسمانیت اور عرش پر بیٹھنے جیسی بشری صفات سے متصف مانا۔ اس لیے اللہ تعالی اور اس کی مخلوق کے درمیان مساوات وبرابری کرنے کی وجہ سے ان کا شمار مشرکین کے ہی گروہ سے ہوگا۔

---

(۱) طبائعی: ایک فرقہ ہے جو طبائع اربعہ یعنی حرارت، برودت، رطوبت اور خشکی کی عبادت کرتے ہیں، کیوں کہ یہی چاروں اصل الوجود ہیں، اس لیے کہ عالم انہیں چاروں سے مرکب ہے، اس طرح ان کے نزدیک خالق چار ہوگئے۔

(۲) افلاکی: یہ ایک فرقہ ہے جو سات ستاروں یعنی زحل، مشتری، مریخ، زہرہ، عطارد، شمس اور قمر کو خالق مانتے ہیں۔

(۳) اہل تجسیم: دو طرح کے ہوتے ہیں: ایک وہ جن کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تمام اجسام کی طرح ایک جسم ہے۔ ایسے لوگ بالاتفاق کافر ہیں۔ اور دوسرے وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالی جسم ہے لیکن ہمارے جسموں کی طرح نہیں۔ ان کے کفر میں اختلاف ہے اور راجح ان کا عدم کفر ہے۔

اور اللہ تعالی نے شرک کی ان سبھی اقسام سے اپنی ذاتِ پاک کی پاکی بیان فرمائی ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿سُبْحَٰنَ ٱللَّهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ﴾ [طور:۴۳] "اللہ تعالی اس سے پاک ہے جس کو یہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں"۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿سُبْحَٰنَ ٱللَّهِ عَمَّا يَصِفُونَ﴾ [صافات:۱۵۹] "اللہ تعالی ان اوصاف سے پاک ہے جن کو یہ لوگ اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

اس کا کوئی مثل نہیں۔

یہاں پر نظیر و مثل کی نفی کر کے اس کی ذات کے لیے کمال ازلی کو ثابت کرنا مقصود ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِۦ شَىْءٌ﴾ [شوری:۱۱] "اس کا کوئی مثل نہیں"۔ اس مفہوم میں یہ آیت محکم ہے لہذا ان تمام آیات متشابہات کو جن کے ظاہری معنی سے "اہلِ تشبیہ" نے استدلال کیا ہے، اسی پر محمول کیا جائے گا اور اسی محکم کی روشنی میں ان متشابہات کو بھی سمجھا جائے گا۔

کوئی بھی چیز اسے عاجز نہیں کر سکتی۔

یہ صفت اس کی با کمال اور بے مثال قدرت کو اجاگر کرتی ہے، کیوں کہ اس کے سوا ہر چیز کا وجود اسی کے ایجاد سے ہے، لہذا یہ بات عقل میں سمانے والی نہیں ہے کہ کوئی چیز ایسی بھی ہے جو اسے عاجز کر سکتی ہے، کیوں کہ عجز نقص کی نشانی ہے اور اللہ ہر طرح کے نقص سے پاک ہے۔ اور اس کی ایک دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ اسے ہر چیز پر کمالِ قدرت حاصل ہے، لہذا عجز اس کے شایانِ شان نہیں ہے، ورنہ دو نقیضوں کا اجتماع لازم آئے گا! اور اس کی ایک تیسری وجہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالی تمام اشیاء کا خالق ہے اور عجز کے ہوتے

ہوئے تخلیق کا تصور بعید از عقل ہے۔ اسی نکتے کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿أَوَلَيْسَ ٱلَّذِى خَلَقَ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضَ بِقَٰدِرٍ عَلَىٰٓ أَن يَخْلُقَ مِثْلَهُم ۚ بَلَىٰ وَهُوَ ٱلْخَلَّٰقُ ٱلْعَلِيمُ﴾ [یس:۸۱] "جس نے آسمان وزمین پیدا کیے کیا وہ اس بات پر قادر نہیں کہ ان کے مثل پھر پیدا کر دے، کیوں نہیں وہ تو بہت زیادہ پیدا کرنے والا ہر چیز کا جاننے والا ہے"۔

اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔

یہ اللہ کے سوا ہر معبود کی نفی ہے اس لیے کہ لغت میں الٰہ کا معنی معبود ہوتا ہے، چوں کہ قریش اس اعتراف کے ساتھ ساتھ کہ خالق اللہ ہی ہے، بتوں کو بھی پوجتے تھے۔ اس بارے میں جب ان سے پوچھا جاتا، تو کہتے: ہم ان کی پرستش اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں گے۔ اس لیے "اس کے سوا کوئی معبود نہیں" اور "اس کا کوئی شریک نہیں" دونوں اپنے آپ میں الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں، اس لیے اس کو تکرار نہیں کہا جا سکتا۔

اللہ تعالی کی صفات

قدم وبقا

[قدم:]

وہ قدیم ہے، اس کی کوئی انتہا نہیں۔

کیوں کہ اگر وہ حادث[1] ہوتا، تو کسی نہ کسی محدِث یعنی وجود دینے والے کا محتاج ہوتا

(۱) حادث کا معنی ہے کہ اس کا وجود پہلے نہیں تھا، پھر ہوا، پھر وہ فنا ہو جائے گا۔

اور یہ دوسرا بھی کسی تیسرے کا محتاج ہوتا، اسی طرح یہ سلسلہ آگے تک چلتا رہتا، اور آخر میں آکر یہ سلسلہ یا تو کسی قدیم پر جا کر رک جاتا یا پھر تسلسل کی منزل پر رواں دواں رہتا، لیکن چوں کہ تسلسل محال ہے، اس لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ یہ سلسلہ آخر میں کسی قدیم پر جا کر تھم جائے۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے قدیم کے دامن میں بسنے والے معنی قدم میں زور پیدا کرنے کے لیے فرمایا: "**بغیر کسی ابتدا کے** "وہ قدیم ہے، کیوں اگر لغت کے زاویہ سے اس کو دیکھیں تو یہ اہل عرب کے قول: "قَدُمَ الشیءُ قِدَماً فهو قديمٌ" سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے اس شَے پر ایک عرصہ دراز گزر چکا ہے۔ امام زمخشری نے: ﴿عَادَ كَٱلْعُرْجُونِ ٱلْقَدِيمِ﴾ [یس: ۳۹] "یہاں تک کہ پھر وہ کھجور کی پرانی ڈال کی طرح ہوگیا"۔ کی تفسیر میں فرمایا: قدیم اسے کہتے ہیں جس پر (کم سے کم) ایک سال کا عرصہ گزر چکا ہو، کیوں کہ جب تک کسی چیز پر ایک سال کا عرصہ نہ گزرا ہو اس وقت تک اس کو قدیم نہیں کہہ سکتے۔ عرف میں جب اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے تو عام طور پر یہی معنی مراد ہوتا ہے۔ اہل عرب کہتے ہیں: هذا بِناءٌ قَديم (یہ قدیم عمارت ہے۔) وهذا شَيخٌ قديمٌ (اور یہ قدیم یعنی بزرگ شیخ ہیں۔) لیکن یہ معنی اللہ تعالی کے لیے مراد نہیں ہو سکتا، اس لیے جب یہ کہا جاتا ہے کہ اس کی صفت قدیم ہونا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے وجود کی کوئی ابتدا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "بلا ابتداء" کے ذریعہ سے قدیم کی تاکید فرمائی، تاکہ لغوی اور عرفی معنی کی طرف کسی کا ذہن نہ جائے۔

[بقاء:]

وہ ہمیشہ رہے گا، اس کی کوئی انتہا نہیں۔

جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ اللہ تعالی "قدیم" ہے، تو اسی کے ضمن میں یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ وہ "باقی" ہے یعنی ہمیشہ ہمیش رہنے والا ہے، کیوں کہ قدم، عدم یعنی فنا کے منافی ہے۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مقام پر بقاء کے ساتھ عدمِ فنا کی قید اس لیے بڑھائی تا کہ یہ بات ذہن میں نقش ہو جائے کہ اس کا دوام اور اس کی بقا کا تعلق کسی زمانہ سے نہیں ہے، کیوں کہ وہ تو ایک دن فنا ہو جائے گا۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿هُوَ ٱلْأَوَّلُ وَٱلْآخِرُ﴾ [حدید:۳] "وہی اول ہے اور وہی آخر بھی"۔ یہاں پر "اول و آخر" کا یہی مطلب ہے کہ وہ بذات خود اول ہے اور بذات خود آخر بھی، اس کے قدم وبقا کا تعلق کسی زمانہ سے نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مقام پر اللہ تعالی نے اپنے وصف میں دو متقابل صفات کا ذکر فرمایا، تا کہ اِس اولیت یا آخریت سے اُس اولیت یا آخریت کا تصور ذہن میں نہ آئے جس کا تعلق کسی زمانے سے ہوتا ہے، کیوں کہ یہ تو بشری اولیت یا آخریت ہے کہ وہ اپنے ماقبل یا مابعد کے زمانے کے توسط سے پائی جاتی ہے۔ اور اللہ تعالی کی یہ صفات بذات خود ہیں، کسی زمانے کی محتاج نہیں ہیں۔

وہ نہ تو کبھی فنا ہو گا اور نہ ہی ہلاک۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے "فنا اور ہلاکت" دونوں لفظوں کو ایک ساتھ اس لیے ذکر کیا تا کہ دوام وبقا کے معنی میں تاکید پیدا ہو سکے۔

دونوں کے ایک ساتھ ذکر کرنے کا ایک سبب یہ بھی بتایا گیا ہے کہ پہلے سے ذات کی

فنا کی نفی کرنا مقصود ہے اور دوسرے سے حیات اور اسی طرح دوسری صفات کے زوال کی نفی مقصود ہے، کیوں کہ زوال وفنا کا تصور بھی اس کی ذات وصفات کے لیے محال ہے، اس لیے کہ اس کا قدم بذاتہ ہے اور اس کے قدم کے ذاتی ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے وجود کا وجوب بذاتہ ہے اور جو بذاتہ ہوتا ہے وہ کبھی فنا نہیں ہوتا۔

صفت ارادہ اور اس میں پائی جانے والی مختلف آراء

جس چیز کا وہ ارادہ کرتا ہے وہی ہوتا ہے۔

کیوں کہ اس کے سوا جتنے بھی موجودات ہیں وہ سب اسی کی تخلیق و تکوین اور ارادہ سے وجود میں آئے، اس لیے کہ اس کے سوا جو بھی ہے سب ممکن ہے، اور جو ممکن ہوتا ہے اس کے [وجود وعدم] دونوں پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کے راجح ہونے کے لیے کسی ترجیح دینے والے کا ہونا ضروری ہے اور اسی ترجیح دینے والے کو [علم کلام کی اصطلاح میں] ارادہ کہتے ہیں، لہذا ایک اللہ تعالی کے سوا کوئی بھی مرید یعنی ارادہ فرمانے والا نہیں ہے۔

ارشاد باری تعالی ہے: ﴿ٱللَّهُ يَفۡعَلُ مَا يَشَآءُ﴾ [آل عمران:۴۰] "اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے"۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿إِنَّ ٱللَّهَ يَحۡكُمُ مَا يُرِيدُ﴾ [مائدہ:۱] "بے شک اللہ جس کا چاہتا ہے حکم دیتا ہے" اسی طرح ایک تیسرے مقام پر فرمایا: ﴿إِنَّمَا قَوۡلُنَا لِشَيۡءٍ إِذَآ أَرَدۡنَٰهُ أَن نَّقُولَ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ﴾ [نحل:۴۰] "جب ہم کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو اس سے یہی کہتے ہیں: ہو جا! تو وہ ہو جاتی ہے"۔ اللہ تعالی نے اپنے وصف میں

مشیت و ارادہ[1] کا ذکر فرمایا ہے، جس سے صاف پتا چلتا ہے کہ یہ دونوں صفتیں اس کے لیے حقیقی ہوں گی مجازی نہیں، جیسا کہ کَعبی اور نظّام جیسے ان کے معتزلی پیروکاروں کا خیال ہے۔ اس کی توجیہ میں وہ یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ ارادہ حقیقت میں شہوت کا نام ہے، جو کہ اللہ تعالیٰ کے لیے محال ہے۔

صفت ارادہ کی تعریف: لیکن ہم اہلِ سنت وجماعت کے نزدیک صفت ارادہ کی تعریف کچھ یوں کی گئی ہے: وہ صفت جو مفعول کے لیے کسی ایک خاص ممکن صورت کو چھوڑ کر کسی دوسری خاص [ممکن] صورت کا یا کسی ایک خاص [ممکن] زمانے کو چھوڑ کر اس کے لیے کسی دوسرے خاص [ممکن] زمانے کا انتخاب کرتی ہے۔ اس لیے کہ اگر صفت

---

(۱) جمہور کے نزدیک ارادہ اور مشیت دونوں مترادف اور متحد ہیں، بر خلاف کرامیہ کے، کیوں کہ ان کے نزدیک مشیئت صفتِ ازلی ہے، اور یہ صرف ایک ہی صفت ہے، اس کی انواع نہیں اور ارادہ صفت حادث ہے، اور وہ متعدد صفات ہیں، جتنی مقدار میں اللہ تعالیٰ کے مرادات اتنی ہی مقدار میں صفاتِ ارادہ۔

(تحفۃ المرید شرح جوہرۃ التوحید للباجوری)

پھر یہ کہ اہل سنت کے نزدیک ارادہ ومشیئت اور رضاوپسندیدگی میں فرق ہے، ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی مراد ہو اور اس میں اس کی رضا بھی ہو، جیسے ایمانِ ابو بکر رضی اللہ عنہ، کہ ان کا ایمان اللہ تعالیٰ کی مراد بھی ہے اور اس میں اس کی رضا بھی ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی چیز اللہ تعالیٰ کی مراد ہو، یعنی اس نے اس کا ارادہ کیا ہو، لیکن اس سے وہ راضی نہ ہو، اور نہ ہی اس کو پسند کرتا ہو، جیسے کفرِ ابو جہل کہ یہ اس کی مراد تو ہے، لیکن اس میں اس کی رضاوپسندیدگی نہیں ہے۔ اور اس بات پر سب سے بڑی دلیل کہ کفرِ ابو جہل اللہ کی مراد ہے اس کے کفر کا وجود میں واقع ہونا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے ملک میں کوئی بھی چیز اس کے ارادے کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی ورنہ اللہ تعالیٰ کا عجز لازم آئے گا جو کہ محال ہے۔ اس مسئلے میں معتزلہ کا اختلاف ہے، ان کے نزدیک کفر ومعاصی اللہ تعالیٰ کی مراد نہیں ہو سکتے، بلکہ یہ محض بندے کے ارادے سے وجود میں آتے ہیں۔ (خلاصہ از "شرح الخریدۃ البہیۃ للامام الدردیر)

ارادہ نہ ہوتی تو تمام ممکنات ایک ہی زمانے میں ایک ہی شکل وصورت پر وجود میں آجاتے۔
کیوں کہ تمام مقولات یعنی ممکنات کا ربِ حکیم کی حکمتِ عظیم کے تقاضے کے مطابق
مختلف شکل وصورت کے ساتھ، گوناں گوں اوصاف کے سانچے میں ڈھل کر، ایک حیرت
انگیز نظم ونسق کی لڑی میں سج کر، یکے بعد دیگرے معرضِ وجود میں آنا، اس بات کی دلیل
ہے کہ ان سب کا خالق صفتِ ارادہ سے متصف ہے۔ اس لیے کہ یہ مختلف رنگ وبو،
اجزائے عالم کی یہ نیرنگیاں، حیرت پر مجبور کر دینے والی یہ دل فریب بو قلمونیاں، خود بخود
اپنی طبیعت کے اثر سے تو نہیں ہیں، بلکہ یہ سب کارستانیاں کسی فاعلِ [مختار] ہی کی ہو سکتی
ہیں۔

اور معتزلہ کا یہ وہم کہ ارادہ حقیقت میں شہوت کا نام ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں
ہے، بلکہ یہ تاویل صرف اس بنا پر ہے کہ کسی بھی طریقے سے اللہ تعالی سے اس صفت ارادہ
کی نفی کر دیں، چاہے اس کا کوئی سر پیر ہو یا نہ ہو! کیوں کہ شہوت اس مخصوص ارادے
کو کہتے ہیں، جس میں مرید یعنی چاہنے والے کے لیے کسی طرح کا کوئی فائدہ ہو۔ اور چوں کہ
اللہ تعالی کسی بھی طرح کے فائدہ ونقصان سے مطلقاً بے نیاز ہے، اس لیے اس کے ارادے
کو شہوت نہیں کہا جا سکتا، بلکہ وہ تو محض ربوبیت ہو گا۔

اور لغت میں لفظ ارادہ "الرَّوَد" سے مشتق ہے، جس کا معنی ہوتا ہے "طلب"، اسی
وجہ سے چارے کے طلب گار کو [عربی زبان میں] "رائد" کہا جاتا ہے، جس سے یہ محاورہ
بھی معرض وجود میں آیا: "الرائدُ لا یکذِبُ أهلَه" "ایک قائد اپنی قوم سے جھوٹ
نہیں بولتا۔

اللہ تعالیٰ کا تمام حوادث سے جدا ہونا

اس تک نہ کوئی وہم پہنچ سکتا ہے، اور نہ ہی کسی فہم کو اس کا ادراک ہو سکتا ہے۔

وہم: ایسی قوت کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ سے جزئیات کا ادراک ہو۔ [1] اور فہم: کا اطلاق اس وقت ہوتا ہے جب عقل کو کلیات [2] کا علم ہو جائے۔ اور اللہ تعالیٰ شکل و کیفیت سے پاک ہے کہ اوہام میں اس کا عکس اترے، اسی طرح نہ ہی اس کی کوئی حد ہے کہ عقل اس کی حقیقت تک پہنچ کر اس کا احاطہ کر سکے۔ بلکہ وہ تو ان تمام چیزوں سے بالاتر ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَا يُحِيطُونَ بِهِۦ عِلْمًا﴾ [طہ:۱۱۰] "ان کا علم اس کا احاطہ نہیں کر سکتا" اس لیے کہ اسی کے تمام اطراف کا علمی احاطہ کیا جاسکتا ہے جس کی کوئی حد اور کوئی انتہا ہو [اور اللہ تعالیٰ کی کوئی حد اور انتہا نہیں اس لیے اس کا کوئی احاطہ بھی نہیں کر سکتا۔]

انام یعنی مخلوق میں سے کوئی بھی اس کی طرح نہیں ہے۔

اَنام یعنی مخلوق کی تفسیر میں کئی اقوال ہیں، پہلا ہے: جس میں بھی روح ہو اس کو انام

---

(۱) جیسے: زید، بکر، عمر، زید کا گھوڑا، بکر کا درخت اور عمر کی سائکل، یہ سب جزئیات ہیں ان کی خارج میں اپنی مخصوص ایک شکل وصورت ہے۔

(۲) جیسے: انسان، حیوان، درخت، اور سائکل، ان سب کی خارج میں اپنی کوئی مخصوص شکل وصورت نہیں ہے، بلکہ ان کی شکل ان کے افراد کے ضمن میں پائی جاتی ہے اور یہ ان کی اپنی شکل نہیں ہوتی بلکہ ان کے افراد کی شکل ہوتی ہے۔

چوں کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی شکل وصورت اور آکار نہیں، وہ نراکار ہے، اور نہ ہی وہ کُلّی ہے، کیوں کی کلی میں کثرت کا مفہوم ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر طرح کی کثرت سے پاک وبے نیاز ہے، اس لیے نہ تو اس تک کسی وہم کی رسائی ہے اور نہ ہی کسی فہم وسمجھ کی پہنچ۔

کہہ سکتے ہیں۔ دوسرا ہے: کوئی بھی مخلوق ہو [خواہ اس میں روح ہو یا نہ ہو] اس کو انام کہہ سکتے ہیں، اور تیسرا ہے کہ انام سے یہاں پر مراد بشر ہے۔ اور یہاں پر یہی آخری قول سب سے زیادہ مناسب ہے، اس لیے کہ اس کے ذریعہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اہل تشبیہ اور اہل تجسیم کا رد کرنا چاہا ہے، جن کا اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ عقیدہ ہے کہ وہ بشری صورت میں ایک جسم ہے۔ اور اس کے ذریعہ نصاریٰ کے اس عقیدے کا بھی رد فرمانا چاہا ہے کہ اس کا ایک بیٹا اور ایک بیوی بھی ہے۔ اللہ تمام ان تمام چیزوں سے پاک ہے۔ اور جو بیٹا ہوتا ہے وہ [صفات میں یا شکل وصورت میں] اپنے باپ کے مشابہ ہوتا ہے، اس معنی کو دیکھتے ہوئے ان کا قول: "وَلا يُشبِهُه الأنامُ" یعنی مخلوق میں سے کوئی بھی اس کے مشابہ نہیں، اور اس سے پہلے جو گزرا کہ "لا شيءَ مثلُه" یعنی کوئی بھی اس کے مثل نہیں، دونوں دو الگ مفہوم کا فائدہ دے رہے ہیں، کیوں کہ پہلا عام ہے، اور یہ دوسرا خاص ہے، اس لیے اگر دونوں کو اکٹھا کر کے دیکھیے تو مجموعی حیثیت سے دونوں ان تمام اوصاف سے اللہ تعالیٰ کی تنزیہہ بیان کرنے میں مبالغہ کا فائدہ دے رہے ہیں جو اس کے شایانِ شان نہیں ہیں۔

[مُماثلہ، مشابہہ، مضاہاۃ اور مشاکلہ کے درمیان میں فرق:]

امام ابو معین نسفی[1] رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "التبصرہ" میں فرمایا ہے: مماثلہ اسمِ جنس

---

(۱) آپ کا نام ابو المعین میمون بن محمد بن محمد النسفی ہے۔ آپ مذہب ماتریدی کے بانی امام ابو منصور ماتریدی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد مذہب ماتریدی کے سب سے بڑے اماموں میں سے ایک ہیں۔ آپ نے امام ماترید رحمۃ اللہ علیہ کی آراء کو مزید تنقیح وتوضیح اور شرح وتسہیل کے ساتھ پیش کیا، درحقیقت آپ امام ابو معین النسفی کی مشہور زمانہ کتاب "تبصرة الأدلة" کو امام ماتریدی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "التوحید" کی شرح اور اس کی تفصیل کہہ سکتے ہیں۔ آپ کو مذہب ماتریدی میں وہی مقام حاصل ہے جو امام باقلانی، امام غزالی اور امام رازی

ہے، جس کے تحت چار انواع آتی ہیں یعنی اس کی چار قسمیں ہیں: مشابہہ، مضاہاۃ، مشاکلہ اور مساواۃ۔ اللہ تعالی مماثلہ سے بھی اور اس کی تمام انواع سے بھی پاک ہے، کیوں کہ جو دو مثل ہوتے ہیں ان میں سے ایک کو دوسرے کی جگہ پر رکھا جا سکتا ہے، وہ ایک دوسرے کے قائم مقام بھی ہو سکتے ہیں، اور جو چیز ان میں سے ایک کے لیے ممکن ہو وہ دوسرے کے لیے بھی ممکن ہوتی ہے، لیکن اللہ تعالی کے سوا جو بھی ہے اسے اللہ تعالی کی جگہ نہیں رکھا جا سکتا، کیوں کہ وہ قاہر ہے اس کے سوا سب مقہور، وہ غالب ہے اس کے سوا سب مغلوب اور جو چیز قہار کے لیے ممکن ہے وہ مقہور کے لیے ممکن نہیں اور جو شئ غالب کے لیے جائز ہے وہی مغلوب کے لیے محال۔

یہ تو تھی [متکلمین] کی اصطلاح، لیکن اگر محققین کی بات کریں تو ان کے یہاں اس کی تقسیم دوسرے انداز میں دیکھنے کو ملتی ہے، کیوں کہ ان کے نزدیک اگر نوع میں اتحاد ہو تو اس کو مماثَلہ کہتے ہیں، جنس میں ہو تو اس کو مجانَسہ کہتے ہیں، مقدار میں ہو تو اس کو مساواۃ کہتے ہیں، کیفیت میں ہو تو اس کو مشابہہ کہتے ہیں، نَسبی یگانگی میں ہو جیسے زید و عمرو کا بکر کی اولاد ہونے میں مشترک ہونا تو اس کو مناسبہ کہتے ہیں، شکل میں ہو تو اس کو مشاکَلہ کہتے ہیں، وضع و کیفیت میں ہو تو اسی کو موازاۃ یعنی مقابلہ کہتے ہیں، جیسے دو طشتوں کو آپس میں تلے اوپر رکھنے سے ان کے اطراف ایک دوسرے پر برابر برابر بیٹھ جائیں تو اسی کو موازاۃ کہیں گے۔

رحمۃ اللہ علیہ کو مذہب اشعری میں حاصل ہے"۔ التمہید لقواعد التوحید" اور "بحر الکلام فی علم التوحید" بھی آپ ہی کی نایاب تصنیف ہیں۔ آپ کا سن وفات: ۵۰۸ھ ہے۔

اللہ تعالیٰ کی حیات

وہ ایسی حیات والا ہے جسے کبھی موت نہیں آسکتی۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ٱللَّهُ ٱلَّذِى جَعَلَ لَكُمُ ٱلْأَرْضَ قَرَارًا وَٱلسَّمَآءَ بِنَآءً وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُم مِّنَ ٱلطَّيِّبَٰتِ ۚ ذَٰلِكُمُ ٱللَّهُ رَبُّكُمْ ۖ فَتَبَارَكَ ٱللَّهُ رَبُّ ٱلْعَٰلَمِينَ هُوَ ٱلْحَىُّ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ﴾[غافر:٦٤] "اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو ٹھہرنے کی جگہ بنائی اور آسمان کا شامیانہ تانا اور تمہاری صورت بنائی تو بہت اچھی بنائی، پاکیزہ چیزوں کو تمہارے رزق کا سامان کیا، یہ ہے اللہ تمہارا رب، تو اللہ بڑی برکت والا ہے جو سارے جہاں کا رب ہے وہ حی ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں"۔

اس آیت میں عقل و نقل دونوں لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی حیات کے لیے دلائل موجود ہیں، کیوں کہ اس کی ابتدا خالق کے ذکر سے ہوتی ہے، پھر اس کے بعد "جعل" جس کا معنی یہاں پر ہے "پیدا کیا" کے ذریعہ کاریگری کا ذکر کیا جاتا ہے، اس کے بعد "الأرض" کے ذریعہ مصنوع (مخلوق) کا تذکرہ چھیڑا جاتا ہے اور "قرارا" یعنی "ٹھہرا ہوا" کے ذریعہ اس مصنوعیت پر دلیل بھی قائم کی جاتی ہے، اس طرح سے کہ زمین کی ہزار وسعت و درازگی کے باوجود اسے اس طرح سے آرام دہ بنایا کہ اس پر اس کی مخلوق قرار حاصل کر سکے، اس کو اپنا بچھونا بنا سکے، اس پر گزر بسر کر سکے اور وہ ان کے سامنے اس طرح سرنگوں ہو کہ اپنا دفع کرنے کی بھی اس میں تاب نہ ہو، اس کے ساتھ ساتھ اس کے سینہ کو چیر کر اس میں نہروں کا جال بچھایا، اس سے طرح طرح کے پھل اگائے، اس کے بعد فرمایا: "وَٱلسَّمَآءَ بِنَآءً" یعنی تمہارے سروں پر ہم نے آسمان کا محفوظ شامیانہ تانا جو

ہوا میں بغیر کسی ستون اور بغیر کسی سہارے کے قائم ہے۔

پھر اہل عقل سے ان کے اجسام کی بناوٹ، ان کے بدنوں کی ترکیب کے بارے میں خطاب فرمایا، تاکہ وہ اس کی الوہیت کی نشانیوں میں اور اس کی قدرت و حکمت کے کمال میں غور و فکر کریں۔ ارشاد باری تعالی ہے ﴿وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ﴾ [غافر:۶۴] "اس نے تمہاری صورت بنائی تو بہت اچھی بنائی" اور وہ یہ بات خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ پہلے ان کی حیثیت صرف ایک بے جان نطفے کی تھی جو مرد کی صلب اور عورت کے سینہ کی اوپری ہڈی سے نکلا تھا، پھر وہ ایک محفوظ مکان میں پہنچ کر ٹھہر گیا، جو تین تین اندھیروں کے اندر تھا، جس کے بعد والدین کا سارا عمل دخل بھی اسی تاریکی میں کہیں جاکر دفن ہو گیا اور پھر انہیں اپنی بے مثال کاریگری کے آثار کے ذریعہ اپنی ربوبیت پر بھی آگاہی دلائی، چنانچہ اس کے بعد ارشاد ہوا: "وَصَوَّرَكُمْ" "اور اس نے تمہاری صورت بنائی"۔ انہیں یہ بات بھی بتائی کہ اس کا یہ شاہکار اپنے آپ میں مہارت و فن کاری کی کس بلندی پر فائز ہے، چنانچہ آگے ارشاد ہوا: ﴿فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ﴾ [غافر:۶۴] "تو اس نے تمہاری اچھی صورت بنائی"۔ یعنی اس کی نوک پلک سنوار کر، اسے ایک صاف ستھرے دل آویز سانچہ میں ڈھالا، جس میں کسی بھی طرح کے نقص کا شائبہ تک نہیں تھا اور سر سے لے کر پاؤں تک تمہارے بدن میں ایسی ایسی چیزیں رکھیں جس کے حسن کے ادراک سے عقلیں انگشت بدنداں ہیں اور سب سے بڑھ کر اس میں عقل رکھی جو ہر چیز کا ادراک کر کے اس کی حقیقت تمہارے سامنے کھول کر رکھ دیتی ہے۔

پھر انہیں ان پر اپنے کیے ہوئے احسانات، انہیں اپنی دی ہوئی نعمتیں یاد دلائیں، جن

نعمتوں کے ذریعہ ان کی زندگی کا سفر آگے بھی جاری رہ سکے، ارشاد ہوا: ﴿وَرَزَقَكُم مِّنَ ٱلطَّيِّبَٰتِ﴾ [انفال:۲۶] "پاکیزہ چیزوں کو تمہارے رزق کا سامان کیا۔ یعنی زمین سے پیدا ہونے والی چیزوں میں جو چیز سب سے اچھی تھی اس کو تمہارا لقمہ بنایا، کیوں کہ اس نے زمین سے انواع واقسام کے سبزے نکالے، پھر ان میں جو سب سے زیادہ نرم، سب سے بڑھ کر اچھا تھا، اسی کو بشر کا رزق قرار دیا اور باقی کو جانوروں کی غذا کے لیے چھوڑ دیا، پھر فرمایا: ﴿ذَٰلِكُمُ ٱللَّهُ رَبُّكُمْ﴾ "یہ ہے تمہارا رب"۔ یعنی جس نے تمہارے لیے یہ سب کیا وہی تمہارا رب ہے اس کے سوا کوئی اور رب کہلانے کا مستحق نہیں۔

پھر فرمایا: ﴿هُوَ ٱلْحَىُّ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ﴾ "وہ حی ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں"۔ انہیں یہ استدلال سکھایا کہ اس قدر اپنے آپ میں مکمل فعل اور کامل کاریگری اسی کے بس کی بات ہے جو حی ہو، قادر ہو اور عالم بھی ہو، اس لیے کہ جو شخص اس طرح کی فن کاری کے شہ پاروں کو کسی ایسے شخص کی طرف منسوب کرے جس میں حیات کا کوئی عنصر ہی نہ ہو تو یہ اس کے جنون کی ہی کار فرمائی کہی جاسکتی ہے، اہل عقل میں اس کا شمار ہونے سے رہا! جس طرح سے فعل محکم کے ذریعہ فاعل کے قادر ہونے پر استدلال کیا جاتا ہے بالکل اسی طرح اس سے اس کے حیات والا ہونے پر بھی استدلال کیا جائے گا، کیوں کہ حیات، قدرت کے ثبوت کے لیے شرط ہے۔

اور اخیر میں: "هُوَ ٱلْحَىُّ" کے ذریعہ اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ وہ تنہا ایسا حی مطلق ہے، جس کی حیات بذاتہ ہے اور اس کے ماسوا جو بھی ہے اس کی حیات عارضی ہے جو کہ اسی کے فیض سے وجود میں آئی ہے، لہذا وہ سب حیات والے تو ہیں، لیکن وہ ایسی حیات

ہے جو ان کی اپنی ذاتی نہیں ہے بلکہ وہ ان کا غیر ہے، یعنی ان کی ذات الگ شئے ہے اور ان کی حیات الگ شَے ہے، اسی وجہ سے جیسے ہی ان پر کوئی آفت آتی ہے ان کی حیات کی ڈور ٹوٹ جاتی ہے، پھر اس کی جگہ موت لے لیتی ہے، لیکن اللہ تعالی کی حیات بذاتہ ہے اسی لیے اس پر موت آنا محال ہے، کیوں کہ جو بذاتہ واجب ہوتا ہے وہ ازلی اور ابدی ہوتا ہے، جس کے لیے زوال نہیں، اسی نکتے کی طرف اللہ تعالی کے اس فرمان میں اشارہ کیا گیا ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَتَوَكَّلْ عَلَى ٱلْحَىِّ ٱلَّذِى لَا يَمُوتُ﴾ [فرقان:۵۸]"اور اس حیات والے پر توکل کرو جس پر کبھی موت نہیں آئے گی"۔

اللہ تعالی کے قیام بنفسہ کا بیان

[قیام بنفسہ:]

وہ قیوّم ہے، جسے نیند نہیں آسکتی۔

[قیوّم کی تعریف:]

اس کی تعریف میں کئی اقوال ہیں، پہلا: جو ہر ایک کے کیے دھرے کا حساب رکھے۔ دوسرا: حفاظت کرنے والا۔ تیسرا: جو مخلوق کے امور کی تدبیر فرمائے۔ چوتھا: جو بذات خود قائم ہو اور دوسروں کو قیام بخشے۔

"**جسے نیند نہیں آتی**" اس قید کے ذریعہ اللہ تعالی کی ذات سے نیند اور اونگھ، سہو وغفلت ہر چیز کی نفی مقصود ہے۔ کیوں کہ نیند ایک طرح کی کمزوری ہے جو انسان پر طاری ہو کر اسے حواس اور اعضاء کا استعمال کرنے سے یکسر روک دیتی ہے، اور اللہ تعالی ہر طرح کی کمزوری سے پاک ہے۔ نیند سے اللہ تعالی کے پاک ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ جو

ذات قیوم ہو، اسے نیند نہ آنا، اس کی ذات کے لوازمات میں سے ہے، کیوں کہ ہر شے اسی کے سبب سے قائم ہے، اور اگر اسی پر نیند طاری ہو جائے، تو کائنات کا سارا نظام ہی درہم برہم ہو جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ يُمْسِكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُولَا وَلَئِنْ زَالَتَا إِنْ أَمْسَكَهُمَا مِنْ أَحَدٍ مِنْ بَعْدِهِ﴾ [فاطر:۴۱] "بے شک اللہ آسمانوں اور زمین کو فنا ہونے سے روکتا ہے، اور اگر یہ ذمہ اس کے سوا کسی اور کے پاس ہوتا تو یقیناً وہ فنا ہو جاتے"۔ یہی سبب ہے کہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے "قیّوم" کے فوراً بعد "اسے نیند نہیں آتی" کا ذکر کیا۔

بغیر کسی ضرورت کے وہ تخلیق فرمانے والا ہے۔

کیوں کہ جسے کسی چیز کی حاجت وضرورت ہو وہ اس ضرورت کو پورا کرنے کا بھی محتاج ہوتا ہے، جو کہ اپنے آپ میں ایک عیب ہے اور اللہ تعالیٰ تو ہر چیز سے بے نیاز ہے، لہٰذا اس کے کسی بھی فعل کے پیچھے اس کی کسی بھی طرح کی کوئی ضرورت کارفرما نہیں ہو سکتی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ﴾ [عنکبوت:۶] "بے شک اللہ سارے جہاں سے بے نیاز ہے"۔

اس بات پر ہو سکتا ہے کوئی یہ اعتراض کرے کہ قرآن میں تو اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک فعل کے پیچھے علت اور ضرورت کا ذکر فرمایا ہے!؟ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ [ذاریات:۵۶] "اور ہم نے جن وانس کو عبادت کرنے کے لیے پیدا کیا"۔ جس کا صاف مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس فعل تخلیق کا مقصد اپنی عبادت کروانا ہے!؟

اس شبہ کا جواب یہ ہو گا کہ اس آیت کا صحیح مطلب یہ ہے کہ ہم نے انہیں اس لیے پیدا کیا تاکہ انہیں اپنی عبادت کا حکم دیں اور اپنی معصیت سے روکیں، پھر معصیت چھوڑ کر اطاعت گزاری کرنے پر انہیں ثواب بھی دیں، لہذا اللہ تعالی کی جانب سے یہ فعلِ تخلیق، مکلفین یعنی انس و جن کی ضرورت کے پیش نظر معرض وجود میں آیا، ناکہ اس میں خالق کا کوئی اپنا فائدہ تھا، کیوں کہ آخر میں اس کا نفع تو انہیں کی طرف لوٹتا تھا، اس کے ہونے نہ ہونے سے اسے کیا ضرر پہنچتا!؟

اس تاویل سے یہ اعتراض بھی دور ہو گیا کہ انس و جن میں سارے لوگوں نے تو اللہ تعالی کی عبادت کی نہیں، اس لیے اللہ تعالی کی یہ دی ہوئی خبر کہ ہم نے انس و جن کو عبادت کرنے کے لیے پیدا کیا، زمینی حقیقت کے خلاف ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالی کے ذریعہ ان کی تخلیق کا مقصد یہ تھا کہ انہیں عبادت کا حکم دیں اور معصیت سے روکیں، پھر گناہ چھوڑ کر فرماں برداری کرنے پر انہیں ثواب دیں! اور یہ صدفی صد زمینی حقیقت ہے، جس میں کذب بیانی کا شائبہ تک نہیں ہے۔

وہ بغیر مشقت کے رزق دینے والا ہے۔

یعنی وہ مخلوق کو رزق دیتا ہے، اس کے لیے اسے نہ تو کسی محنت و مشقت کی ضرورت پڑتی اور نہ ہی وہ کسی سبب کا محتاج ہوتا ہے، کیوں کہ اس کی ساری مرادیں تو صرف ایک لفظ کن سے پوری ہو جاتی ہیں۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنَاهُ أَنْ نَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ﴾ [نحل:۴۰] "جب ہم کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو اس سے کہتے ہیں ہو جا، تو ہو جاتی ہے"۔ اب اس کمال کی قدرت کے بعد کسی چیز کے کرنے میں کلفت و مشقت محسوس کرنا چہ معنی دارد!؟

بغیر کسی خوف کے موت دینے والا ہے۔

یعنی وہ مخلوق کو موت دیتا ہے، پر اس میں اسے نہ تو کسی کا کوئی خوف محسوس ہوتا ہے اور نہ ہی اسے کوئی وحشت ہوتی ہے، کیوں کہ ان کا وجود و عدم دونوں اس کے لیے برابر ہیں، اس لیے کہ وہ سب پر غالب، سب پر حاوی ہے اور ایک وہی ایسا ہے جس کے لیے دوام وبقا ہے۔

بغیر کسی پریشانی کے انہیں دوبارہ اٹھانے والا ہے۔

کیوں کہ جب اللہ تعالی نے بغیر کسی مشقت و پریشانی کے صرف ایک لفظ "کن" کے ذریعہ سارے جہان کو پیدا فرمادیا جیسا کہ اس سے پہلے گزرا: ﴿إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنَاهُ أَنْ نَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ﴾ [نحل:۴۰] "جب ہم کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو اس سے کہتے ہیں ہو جا، تو ہو جاتی ہے"۔ تو انہیں دوبارہ اٹھانے میں اسے کسی طرح کی کوئی مشقت لاحق ہو، یہ عقل سے پرے ہے! کیوں کہ کسی چیز کو دوبارہ بنانا اسے پہلی مرتبہ بنانے سے زیادہ آسان ہے [جب پہلی مرتبہ تخلیق کرنے میں اسے کوئی مشقت نہیں ہوئی تو دوبارہ اسی عمل کو دہرانے میں مشقت کیوں کر ہو سکتی ہے!؟] اسی نکتے کی طرف اس آیت میں اشارہ موجود ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ﴾ [روم:۲۷] "اور وہ (دوبارہ اٹھانا) اس کے لیے زیادہ آسان ہے!" ارشاد باری تعالی ہے: ﴿أَفَعَيِينَا بِالْخَلْقِ الْأَوَّلِ﴾ [ق:۱۵] "کیا ہم پہلی بار پیدا کرنے سے عاجز آگئے تھے!؟" یعنی جب پہلی بار پیدا کرنے سے ہم عاجز نہیں آئے تھے تو دوسری بار پیدا کرنے سے عاجز کیسے آجائیں گے!؟ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهُ﴾ [انبیا:۱۰۴] "جس طرح

پہلی مرتبہ ہم نے انہیں پیدا کیا تھا اسی طرح دوبارہ انہیں اٹھائیں گے بھی"۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَهُوَ الَّذِي يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ﴾ [روم:۲۷] "اور وہی ہے جو پہلی بار پیدا کرتا ہے، پھر اسی کو دوبارہ پیدا کرے گا"۔

مر کر دوبارہ اٹھنے والوں کے جو منکرین تھے ان کے جواب میں اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا: ﴿أَوَلَمْ يَرَ الْإِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ نُطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُبِينٌ ﴿٧٧﴾ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ قَالَ مَنْ يُحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ ﴿٧٨﴾ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ ﴿٧٩﴾ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ مِنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا فَإِذَا أَنْتُمْ مِنْهُ تُوقِدُونَ ﴿٨٠﴾ أَوَلَيْسَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِقَادِرٍ عَلَى أَنْ يَخْلُقَ مِثْلَهُمْ بَلَى وَهُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيمُ﴾ [یس:۷۷-۸۱] "کیا اس انسان کو نہیں معلوم کہ ہم نے کس طرح سے اسے پانی کی بوند سے پیدا کیا، اب بڑا جھگڑالو بنا پھرتا ہے۔ ہمارے لیے مثل بیان کرتا ہے اور اپنی پیدائش بھول گیا، بولا: کون ہے جو گل جانے کے بعد بھی ہڈیوں کو دوبارہ زندہ کر سکے؟۔ آپ اس سے کہہ دیجیے کہ انہیں وہی دوبارہ زندہ کرے گا جس نے انہیں پہلی بار پیدا کیا تھا اور اسے ہر مخلوق کا علم ہے۔ جس نے سبز درخت سے تمہارے لیے آگ کا انتظام کیا، جبھی تو تم اس سے آگ حاصل کر پاتے ہو۔ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، کیا وہ اس بات پر قادر نہیں کہ دوبارہ پھر انہیں کی طرح پیدا کر دے؟ کیوں نہیں! وہی تو ہے بڑا پیدا کرنے والا اور سب کچھ جاننے والا"۔

جو لوگ دوبارہ اٹھائے جانے کے منکر تھے ایک اور دلیل کے ذریعہ ان کا منہ بند

کرتے ہوئے اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا: ﴿يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُضْغَةٍ مُخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِنُبَيِّنَ لَكُمْ﴾[حج:۵] "اے لوگو! اگر دوبارہ اٹھائے جانے میں تمہیں شک ہے (تو اس میں بھی ذرا غور کرلو کہ) ہم نے پہلے تمہیں مٹی سے پیدا کیا پھر پانی کی بوند سے، پھر جمے ہوئے خون سے، پھر گوشت کی بوٹی سے، شکل بنی ہوئی اور ادھوری، تاکہ ہم ان کے لیے بیان کر دیں"۔ یعنی تم لوگ دوبارہ اٹھائے جانے میں شک اور اس کا انکار کر بھی کیسے سکتے ہو جب کہ اللہ تعالی نے تمہیں مختلف مراحل میں مٹی سے پیدا کیا!؟

﴿مُخَلَّقَةٍ﴾ کا مطلب ہے وہ لوتھڑا جس کی مکمل تصویر بن گئی ہو اور ﴿غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ﴾ کا مطلب ہے، وہ نطفہ جو اپنے حال پر باقی ہو، ابھی اس کی تصویر نا تمام ہو۔ ارشاد باری تعالی: ﴿لِنُبَيِّنَ لَكُمْ﴾ "تاکہ ہم ان کے سامنے بیان کر دیں" یعنی ہم ان کے سامنے اپنی قدرت وبادشاہت کی نشانیاں بیان کر دیں، کیوں کہ جو اس بات پر قادر ہے کہ وہ تمہیں مردہ مٹی سے جیتا جاگتا انسان بنادے، پانی کی بوند سے جما ہوا خون بنادے، پھر اسے گوشت کی بوٹی کی شکل دے دے، وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ قبر میں چلے جانے کے بعد تمہیں دوبارہ وہاں سے اٹھائے، تمہارے جسمانی اعضاء کے سڑ گل کر مٹی میں مل جانے کے بعد بھی تمہیں دوبارہ زندہ کر دے! مرنے کے بعد تمہارے جسم کے ساتھ یہی سب تو پیش آتا ہے! تو جس نے بغیر مشقت کے تمہیں پہلی بار پیدا کیا تھا، وہی تمہیں بغیر کسی مشقت کے دوبارہ بھی اٹھائے گا۔

اللہ تعالیٰ کے اسماء اور اس کی صفات ازلی ہیں

وہ اپنی مخلوق سے پہلے بھی اپنی تمام صفات کے ساتھ قدیم تھا، ان کے ہونے سے اس کی کسی ایسی صفت میں اضافہ نہیں ہوگیا، جو ان سے پہلے اس میں نہیں تھی۔

اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور اس کی صفات عظیمہ، ازلی اور ابدی ہیں، وہ ہمیشہ سے اس کے ساتھ ہیں اور ہمیشہ رہیں گی بھی! اب چاہے وہ صفات ذاتی ہوں، جیسے: حیات، قدرت، علم، ارادہ، مشیئت، سماعت، بصارت؛ یا پھر صفات فعلی ہوں، جیسے: تخلیق، تکوین، اِحیاء (زندگی بخشنا)، اِماتت (موت دینا)، اس لیے کہ یہ سب اسی کی صفات ہیں، اسی کی ذات کے ساتھ قائم ہیں اور سب کی سب قدیم ہیں ان پر زوال نہیں آسکتا۔ (۱)

---

(۱) اللہ تعالیٰ کی صفات دو طرح کی ہیں: صفات ذاتیہ اور صفات فعلیہ۔ **صفت ذاتی:** ایسی صفت کو کہتے ہیں جس کی ضد اللہ تعالیٰ کے لیے محال ہو، جیسے علم و قدرت اللہ تعالیٰ کی صفات ذاتیہ ہیں، کیوں کہ علم کی ضد جہل اور قدرت کی ضد عجز، اللہ تعالیٰ کے حق میں محال ہیں، کیوں کہ وہ عیب ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر طرح کے عیب سے پاک ہے۔ **صفت فعلی:** ایسی صفت کو کہتے ہیں جس کی ضد اللہ تعالیٰ کے لیے ممکن ہو، جیسے رزق اور اِحیا (زندگی دینا) اللہ تعالیٰ کی صفات فعلیہ ہیں، کیوں کہ رزق دینے کی ضد، رزق نہ دینا اور زندگی دینے کی ضد، موت دینا دونوں اللہ تعالیٰ کے لیے ممکن ہیں، اس لیے کہ وہ جسے چاہے جب چاہے رزق دے اور جسے چاہے جب چاہے رزق نہ دے، اسی طرح وہ جسے چاہے جب چاہے زندگی دے اور جسے چاہے جب چاہے موت دے۔

پھر یہ کہ ماتریدی حضرات کے نزدیک صفاتِ فعلیہ قدیم ہیں، اس لیے کہ ہو سکتا ہے ان سب کے نام الگ الگ ہوں، لیکن حقیقت میں یہ سب صفت تکوین کی مختلف شکلیں ہیں اور صفتِ تکوین قدیم ہے اس لیے صفات فعلیہ بھی قدیم ہوں گی۔ لیکن اشاعرہ حضرات کے نزدیک صفاتِ افعال حادث ہیں کیوں

اور وہ اپنی خلق یعنی مخلوقات سے پہلے بھی انہیں صفات سے متصف تھا، یہاں پر خلق سے مراد مخلوق ہے، کیوں کہ کبھی کبھی "خلق" بولا جاتا ہے، لیکن اس سے "مخلوق" مراد لیا جاتا ہے، ارشاد باری تعالی ہے: "﴿هَذَا خَلْقُ اللَّهِ﴾ [لقمان:۱۱]"یعنی" یہ اللہ کی مخلوق ہے"۔ یہاں پر خلق سے مراد صفت خلق نہیں ہے جو کہ اللہ تعالی کی ذات کے ساتھ قائم ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا"لَمْ يَزِدْ بِكونِهِمْ"ان کے یعنی مخلوقات کے وجود میں آنے سے اس کی ذات میں کسی ایسی صفت کا اضافہ نہیں ہو گیا جو ان سے پہلے اس میں نہیں تھی، بلکہ اس کی تمام صفات قدیم ہیں اور ازلی ہیں، وہ ہمیشہ سے اس کی ذات کے ساتھ قائم ہیں اور ہمیشہ اسی کی ذات کے ساتھ قائم رہیں گی۔

اللہ تعالی کے لیے صفات ہونے پر جو کہ اس کی ذات کے ساتھ قائم ہیں عقلی و نقلی دلائل:

نقلی دلائل: ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ﴾ [بقرہ:۲۵۵] "اور وہ اس کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتے"۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿أَنْزَلَهُ بِعِلْمِهِ﴾ [نساء:۱۶۶] "اس نے اس (قرآن) کو اپنے علم سے نازل کیا"۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ﴾ [ذاریات:۵۸] "بے شک اللہ بہت رزق دینے والا، بڑا طاقت ور ہے"۔ ان آیتوں میں اللہ تعالی نے اپنے لیے علم اور قدرت کو ثابت کیا ہے۔ اور

کہ ان کے نزدیک صفات فعلیہ در حقیقت صفت قدرت کے "تعلق تنجیزی حادث" کا نام ہے اور یہ تعلق حادث ہے لہذا صفات فعلیہ بھی حادث ہوں گی۔

اسی طرح باقی صفات کا ثبوت ان آیات میں ملتا ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿الْحَيُّ الْقَيُّومُ﴾ [بقرہ:۲۵۵] "وہ حیات والا اور ہر چیز کو قائم رکھنے والا ہے"۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ [اسراء:۱] "وہ بڑی سماعت وبصارت والا ہے"۔

اس میں معتزلہ کے اس عقیدے کی تردید ہے کہ اللہ تعالی کسی ایسی صفت کے واسطے سے حی، عالم، اور قادر وغیرہ نہیں ہے، جو صفت اس کی ذات پر زائد ہو اور اسی کے ساتھ قائم بھی ہو، بلکہ وہ بذاتہ حی ہے، بذاتہ عالم ہے اور اسی طرح بذاتہ قادر بھی ہے۔[1]

---

(۱) اللہ تعالی کی صفات کی دو اور قسمیں ہیں: **صفات معانی** جن کو صفات ذاتیہ بھی کہتے ہیں جیسے: علم، قدرت، ارادہ وغیرہ، ان صفات کو معانی اس لیے کہتے ہیں کیوں کہ معانی معنی کی جمع ہے اور ان کا معنی اللہ تعالی کی ذات کے ساتھ قائم ہوتا ہے اور **صفات معنویہ** جیسے: اس کا عالم ہونا، اس کا قادر ہونا، اس کا مرید یعنی ارادہ کرنے والا ہونا۔ ان صفات کو معنویہ اس لیے کہتے ہیں، کیوں صفات معانی سے جو حاصل ہونے والا معنی ہے وہی معنویہ کہلاتا ہے، یعنی اگر کسی کے لیے علم یا قدرت ثابت ہے تو اس کا حاصل اور نتیجہ یہ ہے کہ وہ عالم اور قادر ہے۔

جو اللہ تعالی کے لیے صفات معنویہ کے ثبوت کا انکار کرے وہ اسلام کے دائرے سے نکل جائے گا اور جو صفات معانی کا انکار کرے وہ دائرہ اسلام میں تو رہے گا لیکن دائرہ اہل سنت سے نکل جائے گا۔ اللہ تعالی کے لیے صفات معنویہ کے ثبوت میں تو معتزلہ اہلِ سنت کے ساتھ متفق ہیں، لیکن اس کے لیے صفات معانی کے ثبوت میں وہ اہل سنت کے مخالف ہیں اور صفات معانی کے منکر ہیں۔ ان کا گمان یہ ہے کہ صفات معانی اللہ تعالی کی ذات کا غیر ہیں، تو اب اگر وہ کسی ایسے علم کی وجہ سے عالم یا کسی ایسی قدرت کی وجہ سے قادر ہوگا جو اس کی ذات کا غیر ہیں تو اللہ تعالی کی اپنے غیر کی طرف محتاجگی لازم آئے گی اور اللہ تعالی محتاجگی سے بہت برتر وبالا ہے۔ لیکن اہل سنت کی رائے یہ ہے کہ اللہ تعالی کی صفات معانی نہ تو اس کی ذات کا عین ہیں اور نہ غیر، یعنی مفہوم کے اعتبار سے اللہ تعالی کی صفت اس کی ذات کا عین نہیں ذات کا مفہوم الگ ہے اور صفاتِ معانی مثلاً علم وقدرت کا مفہوم الگ ہے۔ اور خارج میں پائے جانے کے اعتبار سے صفات معانی

اس کا ہماری طرف سے جواب یہ ہوگا کہ کسی کو حی ماننا لیکن اس کے لیے حیات کو نہ ماننا، کسی کو عالم جاننا لیکن اس سے علم کی نفی کرنا، کسی کے قادر ہونے کا اقرار کرنا لیکن اس کے لیے قدرت کے ثبوت کا اقرار نہ کرنا عقل سے بعید تر بات ہے۔ یہ ایسے ہی ہوگیا کہ کس کو متحرک کہنا لیکن اس کے لے حرکت کا نہ ماننا! کیوں کہ یہ تمام صفات (عالم، قادر، حی) معانی یعنی (علم، قدرت، حیات) سے مشتق ہیں اور یہ کیسے تصور کیا جاسکتا ہے کہ کسی ذات پر ان صفات کا اطلاق تو ہو، لیکن اس ذات کے لیے ان صفات کا ماخذ اشتقاق یعنی جن معانی سے یہ صفات مشتق ہیں، وہی ثابت نہ ہوں!؟

عقلی دلائل:

رب کائنات نے ہزاروں نیر نگیوں کے باوجود اس کائنات کو جس شان سے بنایا ہے کہ اس میں پختگی و مضبوطی، باکمال فن کاری اور نظم وترتیب کے عجیب وغریب نظارے دیکھنے کو ملتے ہیں! کس طرح کے گردش کرتے افلاک بنائے جن کے اندر بھی سیکڑوں سیارے گردش کرتے نظر آتے ہیں، چاند سورج کو بھی دیکھیے کس شان بے نیازی سے ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے رہتے ہیں، لیکن مجال ہے کہ ایک دوسرے سے مل بیٹھیں اور اگر مل بھی جائیں پھر بھی ایک دوسرے سے نہیں ٹکراتے، رات ودن کا ایسا بے مثال نظام بنایا کہ باری باری خلق خدا کے چکر لگاتے رہتے ہیں، ایک اگر اپنی قوت سے مخلوقات کے چہروں پر سیاہ نقاب ڈالتا ہے، تو دوسرا ان کے چہرے سے نقاب کی اس سیاہی کو کھینچ کر

اس کی ذات کا غیر نہیں، کیوں کہ جب بھی خارج میں یہ صفات پائی جائیں گی اس کی ذات کے ساتھ ہی پائی جائیں گی۔ لہذا یہ صفات جب ذات باری تعالی کا غیر نہیں تو غیر کی طرف احتیاج بھی لازم نہیں آئے گا اور اسی طرح جب عین نہیں تو صفت وموصوف کا اتحاد بھی لازم نہیں آئے۔ فافہم!

انہیں روشن دن عطا کرتا ہے!

حیوانات کے اجسام میں زندگی کی جو رمق، خیر و شر میں امتیاز کرنے کا جو شعور، فائدے مند چیز کو اختیار کرنے اور نقصان دہ چیز سے دور بھاگنے کا جو حاسہ رکھا ہے، یہیں پر بس نہیں، بلکہ ان میں جو دوسرے حواس کو جگہ دی، پھر ان کے اندر سانس لینے کا جو نظام قائم کیا اور پھر جمادات کے اندر جو خاصیتیں ودیعت کی ہیں، اگر اس دنیا کے تمام اہلِ علم و دانش اپنی تمام تر فکری جولانیوں اور ذہنی ریاضتوں کو بٹور کر ساری عمر بھی ان میں غور کریں گے پھر بھی ان کی حقیقت کی گرد تک بھی نہیں پہنچ سکیں گے، حقیقت کو تو چھوڑیے، ان میں جو کمالِ حکمت اور لطائفِ فکر و تدبر کی کرشمہ سازیاں ہیں، اس کے ہزارویں حصے تک بھی نہیں پہنچ سکتے!

ان تمام مظاہرِ قدرت میں اہلِ عقل کے لیے کھلی ہوئی نشانیاں ہیں کہ ان کا بنانے والا ضرور بالضرور علم، قدرت، مشیئت، ارادہ اور حکمت جیسی صفات کمالیہ سے متصف ہے، اور ان کی اضداد سے پاک و برتر ہے۔

جس طرح سے وہ اپنی صفات کے ساتھ ازلی ہے، اسی طرح وہ ان تمام صفات کے ساتھ ابدی بھی ہے۔

اس کلام کا مقصد اللہ تعالی کی صفات کے ازلی اور ابدی ہونے کو ثابت کرنا ہے۔

صفات کے ازلی ہونے کی دلیل: اگر یہ صفات حادث ہوتیں تو تین صورتوں میں سے کوئی ایک صورت پیش آتی: یا تو وہ صفات اس کی ذات کے ساتھ قائم ہوتیں، یا کسی دوسرے محل کے ساتھ، یا پھر سرے سے کسی محل کے ساتھ قائم ہی نہ ہوتیں اور یہ تینوں ہی صورتیں اپنے آپ میں محال ہیں!

پہلی صورت کے محال ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالی کی ذات کے ساتھ حوادث کا قیام ممکن نہیں [ورنہ وہ بھی انہیں کی طرح حادث ہوتی]۔

دوسری صورت کے محال ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ذات کا کسی ایسی صفت سے متصف ہونا جو صفت اس کو چھوڑ کر کسی غیر کے ساتھ قائم ہو، یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی سیاہ محل کسی ایسی سیاہی سے کالا ہو جو کہ کسی دوسرے محل میں پائی جاتی ہے، یا پھر کوئی شخص کسی ایسی قدرت کے ذریعہ قادر ہو جو قدرت اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے شخص میں پائی جاتی ہے۔ اور ظاہر ہے یہ سب کا سب عقل سے پرے ہے، جس کا حقیقت سے دور کا بھی ناطہ نہیں۔

اور تیسری صورت کے محال ہونے کی وجہ یہ ہے کہ صفات کا کسی محل کے بغیر پایا جانا سرے سے ہی محال ہے، صفت ہو گی تو کسی موصوف (محل) کے ساتھ ہی پائی جائے گی ورنہ نہیں!

جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ اس کی صفات کا ازلی ہونا واجب ہے، تو اسی کے ضمن میں یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ وہ ابدی بھی ہیں! کیوں کہ جو ازلی ہوتا ہے وہ کبھی بھی ختم نہیں ہوتا ہے [اور جو کبھی بھی ختم نہیں ہوتا وہی تو ابدی کہلاتا ہے]۔

[ازل اور ابد کا معنی:]

ازل اور ابد کے اشتقاق کے کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ ازل اس چیز کو کہتے ہیں جس کی ابتدا کی حد جاننے سے دل تنگ پڑ جائے (یعنی کوشش کے باوجود اس کی ابتدا کی حد نہ معلوم ہو سکے) اور یہ "اَزَل" سے مشتق ہے جس کا معنی ہوتا ہے "تنگی" اور "اَبَد" اس چیز کو کہتے ہیں جس کی انتہا کی حد جاننے سے دل متنفر ہو جائے (یعنی کوشش کے باوجود

اس کی انتہا کی حد نہ معلوم ہو سکے) جو کہ "اَبَوَد" سے مشتق ہے، جس کا معنی ہوتا ہے "تنفر"۔ "صِحاح "[1]میں یہ بات مذکور ہے کہ "اَزَل "جو کہ ز کے فتحہ کے ساتھ ہے، اس کا معنی ہے "قِدَم "اور اصطلاح میں اس کا معنی ہوتا ہے: جس کے وجود کی کوئی ابتدا نہ ہو!اور "اَبَدی "کا معنی ہے ہوتا ہے: جس کی کوئی انتہا نہ ہو۔

ایسا نہیں ہے کہ جب سے اس نے مخلوق کو پیدا کیا تب سے اس کا نام خالق پڑا، اور ایسا بھی نہیں ہے کہ جب اس نے "بَرِیَّة" یعنی مخلوق کو وجود بخشا، اس کے بعد اس کا نام باری ہوا۔

خالق اور باری دونوں مترادف الفاظ ہیں۔ اہل عرب کا قول ہے: "بَرَأَ" یعنی "پیدا کیا اور "بَرِیَّة" یعنی مخلوق۔

اس بات کو دوبارہ ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ بات ذہن میں راسخ ہو جائے کہ اللہ تعالی ازل میں بھی صفات کمال سے متصف تھا، اس کی ذات ان صفات کمالیہ میں سے کسی بھی صفت سے خالی نہیں تھی، کیوں کہ ازل میں اس کی ذات کا صفاتِ کمال سے خالی ہونا محال ہے، کیوں کہ یہ ایک طرح کا نقص ہے، جو کہ اللہ تعالی کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس وقت ان صفات سے خالی ہونے کا مطلب ہے کہ ان کے حصول کے لیے اسے عالم کی تخلیق کی ضرورت تھی، جب کہ اس کی شان یہ ہے کہ وہ سارے عالم سے بے نیاز ہے، یہ اس کی شانِ بے نیازی سے پرے ہے کہ تخلیقِ عالم کے

---

(۱) "الصحاح تاج اللغة وصحاح العربية" تالیف: ابو النصر اسماعیل بن حماد الجوہری الفارابی ۳۹۳ھ ت۔

بعد اسے وہ صفات حاصل ہوں جو اس سے پہلے اس کے پاس نہیں تھیں۔

اس کے لیے ربوبیت اس وقت بھی ثابت تھی جب کہ ابھی کسی "مربوب" یعنی مخلوق کا نام ونشان تک نہ تھا، اسی طرح اس وقت بھی وہ "خالقیت" کے وصف سے متصف تھا جب کہ ابھی کسی مخلوق کا پتا تک نہ تھا۔

یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ پہلی بات کی ہی تاکید اور اسی کی تحقیق ہے، کیوں کہ اللہ تعالی مخلوق کے وجود سے پہلے بھی خالق وپروردگار تھا۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ اس میں اشاعرہ حضرات کے اس قول کی نفی ہے کہ "صفاتِ ذاتیہ قدیم ہیں اور صفات افعال جیسے: خلق، ایجاد، تکوین؛ یہ سب حادث ہیں۔ اور یہی قول عام معتزلہ، نجاریہ[1] اور کرّامیہ[2] کا بھی ہے۔

اور ہم (ماتریدی حضرات) کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالی اپنی تمام تر صفات (ذاتیہ اور فعلیہ) کے ساتھ قدیم ہے، کیوں کہ اللہ تعالی نے ازل میں ہی صفات فعل کے ذریعہ اپنی

---

(۱) یہ اسلامی فرقوں میں سے ایک بہت بڑا فرقہ ہے، جس کا بانی حسین بن محمد النجّار ۲۲۰ھ ت ہے۔ کچھ مسائل میں وہ اہل سنت والجماعت کے ساتھ ہیں، جیسے: افعال کی تخلیق، کہ بندے کے ہر فعل کا خالق اللہ تعالی ہے، اسی طرح یہ کہ استطاعت فعل کے ساتھ پائی جاتی ہے وغیرہ اور کچھ مسائل میں معتزلہ کے ساتھ ہیں، جیسے صفاتِ معانی کی نفی کرنا، صفت کلام کا حادث ہونا وغیرہ۔ ان کے تین فرقے ہیں: برغوثیہ، زعفرانیہ، مستدرکہ۔

(۲) یہ "مشبہہ" کا ایک فرقہ ہے، جن کا بانی ابو عبد اللہ محمد بن کرّام السجستانی ۲۵۵ھ ت ہے، وہ اللہ تعالی کے لیے صفات کو تو مانتا تھا، لیکن اس طرح سے کہ ان سے تشبیہ وتجسیم کی صورت پیدا ہو جاتی، ان کا ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالی کی ذات کے ساتھ حوادث کا قیام ممکن ہے، اور پھر آگے چل کر اس ایک فرقے سے کئی فرقے نکلے جن کی تعداد بارہ تک پہنچ جاتی ہے۔

تعریف فرمائی ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ﴾ [حشر:۲۴] "وہی اللہ ہے جو پیدا کرنے والا ہے، وجود بخشنے والا ہے، صورت بنانے والا ہے، اسی کے لیے اچھے نام ہیں"۔ اس سے ثابت ہوا کہ وہ ازل میں بھی خالق تھا، باری تھا اور مصور بھی، جب کہ ابھی نہ تو کوئی مخلوق تھی، نہ کوئی وجود اور نہ ہی کوئی صورت اور نقش و نگار۔

اس کی دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم شدہ "صفات فعلیہ" حادث ہوتیں تو اس کی ذاتِ [قدیم] حوادث کا محل بن جاتی، جو کہ سرے سے ہی باطل ہے، یا پھر وہ اس کی ذات کے سوا کسی دوسرے محل کے ساتھ قائم ہوتیں، یا پھر سرے سے کسی محل میں ہی نہ ہوتیں، اور یہ سبھی صورتیں محال ہیں، جیسا کہ اس کے محال ہونے کا سبب پہلے بھی گزر چکا ہے!

اس کی وجہ یہ ہے، کیوں کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ ازل میں بھی "صفات فعلیہ" سے متصف تھا، کیوں کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے[1]، اگرچہ مقدورات (حوادث) ازل میں موجود نہیں تھیں، اسی طرح تخلیق و تکوین جیسی دوسری صفات سے بھی متصف تھا اگرچہ مخلوقات کا اس وقت نام و نشان بھی نہیں تھا۔ جس طرح سے (اشاعرہ حضرات) کو اس بات کا اقرار ہے کہ وہ ازل میں بھی "عالم، قادر، سمیع اور بصیر" وغیرہ تھا، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کی معلومات و مسموعات اور مقدورات ازل میں موجود ہوں، ہو بہو اسی طرح اس کی تکوین ازلی بھی ہر

(۱) اس میں قدرت کے تعلق صلوحی قدیم کی طرف لطیف اشارہ ہے۔

مکوَّن یعنی (مخلوق) کے لیے اس کے وجود کے وقت تکوین یعنی (تخلیق) ہو گی۔

ہر شے اس کی محتاج ہے، ہر چیز اس پر آسان ہے۔

اس کا مطلب ہے کہ اس کے سوا، ہر چیز اپنے وجود اور اپنی بقا میں اس کی محتاج ہے۔ ہر چیز کا وجود اسی کے ایجاد سے ہے، ہر شَے کا قائم ہونا اسی کے قائم کرنے سے ہے۔ وہ ایسا قیّوم ہے جس کی ہر شَے محتاج ہے، ایک اسی کی ذات تو ایسی ہے جو بے نیاز ہے، باقی تو سب اس کے محتاج ہیں، اس کے صرف ایک لفظ "کن" سے ہی ہر شَے وجود میں آجاتی ہے، لہذا ہر چیز اس کے لیے آسان ہے، وجود بخشنے میں کوئی بھی مشکل اس کے آڑے نہیں آتی۔

وہ کسی کا بھی محتاج نہیں ہے۔

کیوں کہ حاجت و ضرورت ایک طرح کا نقص ہے، جس سے وہ پاک ہے۔ اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جب ہر چیز پر اس کا غلبہ ہے، ہر چیز اس کے ایجاد سے وجود میں آتی ہے، تو وہ کسی دوسرے کا محتاج ہو بھی تو کیوں کر!؟ جب کہ اس نے اپنے آپ کو کمال بے نیازی سے موصوف فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ﴾ [عنکبوت:٦] "بے شک اللہ سارے جہاں سے بے نیاز ہے"۔

اس کی طرح کوئی شَے نہیں، وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔[شوری:١١]

اللہ تعالی سے حاجت اور ضرورت کی نفی کرنے کے بعد اس نص کو ذکر فرمایا، کیوں کہ یہ نص محکم ہے، جس میں کسی بھی طرح کے احتمال کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس میں اللہ تعالی کی ذات سے مخلوق و حوادث کی ہر صفت اور ہر علامت کی نفی ہے اور اس کے لیے ہر صفتِ مدح و کمال کا ثبوت ہے۔ اس لیے اگر صفات فعلیہ حادث ہوتیں، جیسا کہ اشاعرہ

حضرات کا ماننا ہے تو اس سے لازم آتا کہ اس کی صفات بھی حادث ہونے میں مخلوق کی صفات کی طرح ہیں، جب کہ ہر طرح کی مماثلت اور مشابہت کی نفی خود نص صریح سے ثابت ہے۔

(فصل)

اس دنیا میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے سب اللہ تعالی کی لکھی ہوئی تقدیر کے مطابق ہو رہا ہے

اس نے اپنے علم سے مخلوق کو پیدا فرمایا اور ان سب کے لیے تقدیریں لکھیں۔

اس بات کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے، وہ سب اللہ تعالی کی لکھی ہوئی تقدیر کے مطابق ہو رہا ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے تقدیر کے متعلق سوال کیا گیا، تو آپ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ اللہ تعالی اس کا جواب پہلے ہی دے چکا ہے، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: ﴿إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ﴾ [قمر: ۴۹] "بے شک ہم نے ہر چیز ایک اندازہ سے پیدا فرمائی"۔ لہذا اس دنیا میں جو کچھ بھی ہے وہ اس آیت کے عموم میں داخل ہے۔

[تقدیر کی قسمیں:]

تقدیر دو طرح کی ہوتی ہیں:

پہلی: جو چیز جس طرز پر، جس طرح سے بنائی گئی تھی، چاہے وہ خیر ہو یا شر، حسن ہو یا قبح، حکمت ہو یا بے وقوفی، اسی کے مطابق معرض وجود میں بھی آجانا۔ اور یہی حکمت کا معنی ہے، جس کی تعریف اس انداز میں کی گئی ہے: کسی چیز کو اس کی اصلی اور مناسب شکل

پر بنا دینا۔

دوسری: جس حقیقت وصورت پر جو چیز معرضِ وجود میں آنے والی ہو، چاہے وہ خیر ہو یا شر، چاہے اس کو ثواب ملنے والا ہو یا پھر عذاب، اس کو اسی کے مطابق پہلے سے بیان کر دینا۔

ان سب کے لیے موت کا ایک وقت مقرر کیا ہے۔

یہ اس بات کی تحقیق ہے کہ ہر شخص کے لیے موت کا جو وقت متعین ہے وہ "مبرَم اور محکم" ہے، جو ایک پل کی بھی تقدیم وتاخیر کی گنجائش کا احتمال نہیں رکھتا۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ﴾[اعراف: ۳۴] "توجب (ان کی موت) کا وقت آپہنچے گا، تو نہ تو اس میں ایک پل کی تاخیر ہو گی اور نہ ایک پل کی تقدیم"۔

ارشاد باری تعالی ہے: ﴿كِتَابًا مُؤَجَّلًا﴾[آل عمران: ۱۴۵] "لکھا وقت"۔ اس کے دو معنی ہیں:

پہلا: موت کا لکھا وقت، جس میں تقدیم وتاخیر کی ذرہ برابر گنجائش نہیں ہے۔

لوحِ محفوظ کی کھلی ہوئی کتاب، جس میں سب کچھ لکھا ہوا رکھا ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُبِينٍ﴾[یس: ۱۲] "اور ہم نے ہر چیز ایک واضح کتاب میں شمار کر رکھی ہے"۔

ان کو پیدا کرنے سے پہلے بھی ان کے افعال میں سے کوئی بھی فعل اس پر مخفی نہیں تھا اور ان کو پیدا کرنے سے پہلے بھی ان کی جانب سے صادر ہونے والے اعمال سے وہ آگاہ بھی تھا۔

اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ بندوں کو ابھی اللہ تعالی نے لباسِ ہستی پہنایا بھی نہ تھا، پھر بھی ان کے افعال میں سے کوئی بھی فعل اس کے علم سے اوجھل نہیں تھا۔ یہ اس بات کا اقرار ہے کہ مخلوق کے وجود سے پہلے ہی اس کا علم ان کے ہر سیاہ وسفید کو محیط تھا، کیوں کہ اللہ تعالی تمام صفات کے ساتھ قدیم ہے۔ اور اس کی صفات میں سے ایک صفت یہ بھی ہے کہ تمام مخلوقات کے وجود سے پہلے ازل سے ہی تمام معلومات چاہے وہ [واجبات ہوں یا ممکنات یا پھر مستحیلات] ہر چیز کا وہ عالم ہے۔

صفت خلق اور صفت علم کو ایک ساتھ ذکر کرنے کا سبب یہ ہے کہ مخلوق کے (ہر جزو) کا علم ہونا تخلیق کے اولین شرائط میں سے ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ﴾ [ملک: ۱۴] "کیا وہی نہیں جانتا جس نے پیدا کیا"۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَهُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيمُ﴾ [یس:۷۹] "اور وہ بہت پیدا کرنے والا بڑا جاننے والا ہے"۔ ان تمام آیتوں میں صفت خلق کو صفت علم کے ساتھ ملا کر بیان کیا گیا ہے۔

انہیں اپنی اطاعت کا حکم دیا اور اپنی نافرمانی سے منع فرمایا۔

صفت خلق کو ذکر کرنے کے بعد امر و نہی کا ذکر کرنے کا مقصد اس بات کی طرف اشارہ کرنا تھا کہ وجہِ تخلیقِ کائنات یہ ہے کہ اللہ تعالی کے اوامر کو بجالا کر اور اس کے منہیات سے اپنے آپ کو بچا کر اس کی عبادت کی جائے۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَمَا

خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾[ذاریات:۵۶]"اور ہم نے جن وانس کو صرف اس لیے پیدا کیا کہ وہ عبادت کریں۔ یعنی تاکہ ہم انہیں اپنی عبادت کا حکم دیں اور اپنی نافرمانی سے منع کریں۔

یہ بات ذہن نشین کر لیجیے کہ اہلِ سنت وجماعت کے نزدیک ہر حادث چیز کا وقوع، چاہے وہ خیر ہو یا شر، اللہ تعالی کے ارادہ، اس کی مشیئت اور اسی کی قدرت سے ہوتا ہے۔ [1] ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ﴾ [صافات:۹۶]"اور اللہ نے تمہیں اور تمہارے اعمال کو پیدا کیا"۔ یعنی مطلقاً تمہارے عمل کو پیدا کیا[اب چاہے وہ اختیاری ہوں یا غیر اختیاری] ارشاد باری تعالی ہے: ﴿خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ﴾[زمر:۶۲]"وہ ہر شَے کا خالق ہے"۔ چوں کہ بندے کا فعل بھی ایک شَے ہے اس لیے ظاہر ہے وہ اس کا بھی خالق ہوگا۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿قُلْ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ﴾ [نساء:۷۸]"آپ فرما دیجیے کہ ہر چیز اللہ کی طرف سے ہے"۔ امام مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث روایت فرمائی ہے، آپ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک شخص آیا جس کے کپڑے نہایت ہی سفید تھے۔۔۔ اس نے سوال کیا: ہمیں ایمان کے بارے میں بتائیے، تو آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: «ایمان یہ ہے کہ آپ اللہ کی، اس کے فرشتوں کی، اس کی کتابوں کی، اس کے رسولوں کی

---

(۱) اہل سنت والجماعت کے نزدیک بندے کے جتنے بھی افعال ہیں چاہے وہ اختیاری ہوں یا غیر اختیاری سب کا خالق اللہ تعالی ہے، لیکن معتزلہ کے نزدیک بندے کے افعالِ غیر اختیاری جیسے چلتے چلتے اچانک گر جانا، چھینک اور کھانسی آجانا، بیمار پڑ جانا، ان سب کا خالق اللہ تعالی ہے، لیکن اس کے افعال اختیاری جیسے روزہ رکھنا یا شراب نوشی کرنا، ان سب کے خالق خود بندے ہیں۔ مزید تفصیل آگے آئے گی۔

اور یوم آخرت کی دل سے تصدیق کیجیے، اور اچھی بری تقدیر کو بھی حق جانیے»"[1]۔ (حدیث)

اس کی مشیئت نافذ ہو کر رہتی ہے۔ بندوں کے لیے جب تک وہ کچھ نہ چاہے اس وقت تک ان کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ جو اس نے ان کے لیے چاہا وہ ہو کے رہا اور جو نہیں چاہا وہ کبھی نہیں ہوا۔

جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ﴾ [تکویر:۲۹] "تم لوگ کچھ نہیں چاہتے، جب تک اللہ نہ چاہے، جو سارے جہاں کا رب ہے" اور اس کی عقلی دلیل یہ ہے کہ غیر اللہ کی مشیئت کا نافذ ہو جانا اور اللہ تعالی کی مشیئت کا نافذ نہ ہونا اس کے عجز کی علامت ہے، کیوں کہ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ اللہ کے ملک میں کوئی چیز اس کی مشیئت کے بغیر وقوع پذیر ہو گئی! جو کہ اس کے لیے محال ہے۔

اللہ کی طرف سے ہدایت و عصمت اس کا فضل ہے اور ذلت وضلالت اس کا عدل ہے

وہ جسے چاہتا ہے اسے اپنے فضل سے ہدایت عطا کرتا ہے، اس کی [گناہوں سے] حفاظت کرتا ہے اور اسے عافیت میں رکھتا ہے۔ اور جسے چاہتا ہے اسے اپنے عدل کے مطابق گمراہی سے دوچار کرتا ہے، اسے ذلت کا مزہ چکھاتا ہے اور آزمائش میں مبتلا کرتا ہے۔ وہ سب کے سب اس کے فضل وعدل کے مابین اس کی مشیئت کے دائرے میں

(۱) أخرجه مسلم (۸).

پھرتے رہتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ "قاعدہ اصلح" کی رعایت میں اللہ تعالی پر بندوں کے حق میں کچھ بھی واجب نہیں ہے، بلکہ وہ جس طرح چاہتا ہے ان کے ساتھ برتاؤ کرتا ہے، کیوں کہ یہ سارا جہاں اس کا ملک ہے اور مالک کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ جو چاہے، جس طرح چاہے اپنے ملک میں تصرف کرے۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَيَفْعَلُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ﴾ [ابراہیم: ۲۷] " اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے"۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيدُ﴾ [مائدہ:۱] "بے شک اللہ جس کا چاہتا ہے حکم دیتا ہے"۔

متن کی مذکورہ عبارت میں معتزلہ کے اس عقیدے کی تردید ہے کہ "بندوں کے حق میں جو زیادہ بہتر ہو اللہ تعالی پر اس کا کرنا واجب ہے"۔[1] ان کے اس عقیدے کی تردید میں بہت سی آیات شاہد ہیں، جن میں صراحت کے ساتھ "اضلال" یعنی "گمراہ کرنے" کی نسبت اللہ تعالی کی طرف کی گئی ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿يُضِلُّ اللَّهُ مَنْ

---

(۱) معتزلہ کے جو پانچ اصول ہیں ان میں سے ایک اصول **"صلاح واصلح"** بھی ہے۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ اس عبارت میں دو لفظ ہیں: پہلا صلاح اور دوسرا اصلح"۔ **صلاح** "یہ فساد کے مقابل میں ہوتا ہے، جیسے ایمان جو کہ کفر کے مقابل میں ہے اور ایمان صلاح ہے اور کفر فساد اور اللہ تعالی پر واجب ہے کہ جس میں بندے کے لیے صلاح ہو اسی کا بندے کے حق میں فیصلہ کرے۔ اور دوسرا لفظ ہے **"اصلح"** یعنی دو چیزیں ہیں اور دونوں میں بھلائی وبہتری ہے پر ایک میں دوسرے کے مقابلے میں زیادہ بہتری ہے، جیسے جنت کے دو درجات ہیں ایک ادنی اور دوسرا اعلی، بھلائی دونوں میں ہے پر دوسرے میں پہلے سے زیادہ بھلائی ہے، لہذا اللہ تعالی پر واجب ہے کہ جس میں بندے کے لیے زیادہ بھلائی ہو، اسی کا بندے کے حق میں فیصلہ کرے۔
(شیخ عبد السلام نثار حفظہ اللہ)

يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ﴾ [مدثر:۳۱] "اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت عطا کرتا ہے"۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا﴾ [بقرہ:۲۶] "وہ اس کے ذریعہ بہت سے لوگوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہت سے لوگوں کو ہدایت عطا کرتا ہے"۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ﴾ [یونس: ۹۹] "اور اگر تمہارا رب چاہتا تو زمین میں سبھی لوگ ایمان لے آتے۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ﴾ [نحل:۹] "اور اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت عطا کر دیتا"۔ لہذا بندوں کے حق میں جو بہتر ہے اگر وہ اللہ تعالی پر واجب ہوتا تو پوری دنیا میں کوئی بھی کافر نہیں رہتا اور نہ ہی کوئی اس کی نافرمانی کرتا، کیوں کہ کفر اور نافرمانی بندوں کے حق میں بہتر نہیں ہیں۔

لہذا اگر کسی کے حق میں اس نے ایمان کا ارادہ فرمایا ہے تو یہ محض اس کا فضل ہے، جس میں بندے کا کوئی حق نہیں تھا اور اگر کسی کے حق میں کفر کا فیصلہ فرمایا ہے تو یہ اس کا عدل ہے، جس میں کسی بھی طرح کے ظلم کا کوئی شائبہ تک نہیں، کیوں کہ ظلم کی تعریف ہے: "کسی دوسرے کی ملکیت میں تصرف کرنا یعنی اپنا حق جمانا" اور یہاں پر اللہ تعالی تو اپنے ہی ملک میں تصرف فرما رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی اس کے کسی بھی فعل میں اس سے سوال نہیں کر سکتا۔

معتزلہ کے خلاف ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اگر ان کی یہ بات مان لی جائے کہ بندوں کے حق میں جو بہتر ہے اس کا کرنا اللہ تعالی پر واجب ہے تو اس سے اللہ تعالی کے اس فرمان عالی شان کی نفی لازم آئے گی: ﴿ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ﴾ [حدید:۲۱] "وہ بڑے فضل والا

اور بڑی عظمت والا ہے "کیوں ایسی چیز کے کرنے میں کوئی فضل نہیں جو اس پر واجب ہو!
بالکل اسی طرح اس صورت میں "مُحسِن، منعِم، مُجمِل اور منّان" جیسے اسمائے حسنیٰ بے معنیٰ
نظر آئیں گے، کیوں کہ واجب کی ادائیگی میں نہ تو کوئی احسان ہے، نہ فضل اور نہ ہی کسی
طرح کی کوئی مہربانی۔

نہ تو اس کے فیصلے (قضاء) کو کوئی رد کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کا حکم کر کے حکم کو کوئی ٹال سکتا ہے۔

یہاں پر قضاء سے مراد قضاءِ تکوین [یعنی قضائے مبرَم] ہے، جس کو ٹالنے پر کوئی
بھی شخص قادر نہیں ہے، اس لیے کہ اگر کوئی شخص اس کے فیصلے کو ٹالنے پر قادر ہوتا [تو
اس کے لیے قدرت ثابت ہوتی] اور اللہ تعالیٰ کے لیے عجز ثابت ہوتا، جو کہ محال ہے۔
جب قضا کا ذکر ہو تو تین چیزوں میں سے کوئی ایک چیز مراد ہوتی ہے، یا تو حکم، یا تو
امر، یا پھر فعل۔

اس کے حکم کو کوئی بھی شخص ٹال نہیں سکتا؛ کیوں کہ ہر شخص اس کی جبروتیت اور
قہاریت کے آگے مغلوب ہے، پھر کون ہے جس میں اتنی جرأت ہو!؟

اس کے امر پر کوئی بھی غالب نہیں آسکتا۔

مذکورہ عبارت میں اس چیز کا بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ امر سے مراد "تکوین" ہو۔
جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنَاهُ أَنْ نَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ﴾ [نحل: ٤٠] "جو چیز ہم چاہیں اس سے ہمارا فرمانا یہی ہوتا ہے کہ ہم کہیں ہو جا، وہ
فوراً ہو جاتی ہے" اس آیت میں غیر اللہ سے ربوبیت کی نفی ہے اور اللہ تعالیٰ کے لیے
وحدانیت کا اثبات ہے۔ اور یہاں پر یہ بھی احتمال ہے کہ لفظ "امر" سے مراد "قضاء" ہو۔

اس احتمال کی بنا پر مذکورہ عبارت کا مطلب ہوگا: کوئی بھی شخص جبراً اس پر اپنا فیصلہ نہیں تھوپ سکتا، کیوں کہ ایک وہی تنہا تو ہے جو قہار ہے۔

هم نے ان تمام عقیدوں کی دل سے تصدیق کی اور ہمیں یقین ہے کہ یہ سب اسی کی طرف سے ہے۔

یعنی جو بھی عقائد اس سے پہلے گزرے ہم ان سب کو دل سے سچ جانتے اور مانتے ہیں، لہذا اس عبارت میں "ذلک" یعنی "ان" کے ذریعہ گزشتہ تمام عقیدوں کی طرف اشارہ ہے اور اس کے بعد لفظ "یقین" کے ذریعہ اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ گزشتہ سبھی چیزوں پر ہمارا ایمان لانا محض کسی کی تقلید میں نہیں ہے،[1] بلکہ ایسے نقلی و عقلی

(۱) دلیل اجمالی کے ذریعہ اللہ تعالی کی معرفت کا حاصل ہونا فرض عین ہے اور دلیل تفصیلی کے ذریعہ اس کی معرفت کا حاصل ہونا فرض کفایہ ہے، اب رہ گئی یہ بات کہ ان دونوں دلیلوں میں فرق کیا ہے، تو **دلیل اجمالی** یہ ہے کہ کسی بھی طریقے سے آپ کو معرفتِ الہی حاصل ہو جائے، لیکن آپ اس کی تفصیل سے عاجز ہوں اور اسی طرح اگر اس دلیل پر کوئی شبہ وارد ہو تو آپ اس کا دفاع بھی نہ کر سکیں۔ جیسے کسی کسان کو اس طریقے سے معرفت حاصل ہو کہ جب تک ہم بیج نہیں ڈالتے تو اس وقت تک پودا نہیں اگتا پھر اتنی بڑی کائنات بغیر بنانے والے کے بھلا خود بخود وجود میں کیسے آسکتی ہے!؟ پر وہ اس کو تفصیل سے بیان نہ کر سکے اور اسی طرح اگر اس پر کوئی اعتراض کرے تو وہ اس کا رد بھی نہ کر سکے۔ اور **دلیل تفصیلی** یہ ہے کہ آپ کو جس دلیل کے ذریعہ معرفت حاصل ہوئی ہے اس کے جزئیات اور اس کی تمام تفاصیل سے بھی آگاہ ہوں اور اگر اس پر کوئی شبہ وارد ہو جائے تو اس کا دفاع کرنے پر بھی قادر ہوں۔ جیسے عالم ممکن ہے اور ہر ممکن اپنے وجود میں کسی واجب کا محتاج ہوتا ہے، لہذا یہ عالم اپنے وجود میں ایک واجب کا محتاج ہے اور وہی اللہ تعالی ہے۔

اب اگر کسی شخص کو اللہ تعالی کی معرفت صرف اس کی صفات کے ذریعہ حاصل ہوئی، لیکن اسے نہ تو دلیل اجمالی کا علم ہے اور نہ دلیل تفصیلی کا پتہ، تو ایسا شخص "**مقلد**" کہلائے گا اور مقلد کے ایمان میں

دلائل کی روشنی میں ہے، جن کو جاننے کے بعد ایسا یقینی علم حاصل ہوتا ہے کہ شک کے سبھی بادل چھٹ جاتے ہیں۔

"یقین" اہل عرب کے قول "یَقِنَ الماءُ" سے مشتق ہے، جس کا معنی ہوتا ہے "پانی ٹھہر گیا"۔ اس کا استعمال وہ اس وقت کرتے ہیں جب کہ پانی کسی جگہ پر ٹھہر جائے! دونوں میں مناسبت یہ ہے کہ وہ علم جو دلائل کے ذریعہ ثابت اور مستقر ہو جائے اسے یقین کہتے ہیں، کیوں کہ وہ علم دل اور دماغ دونوں جگہ ٹھہر جاتا ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَكَذَٰلِكَ نُرِي إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلِيَكُونَ مِنَ الْمُوقِنِينَ﴾ [انعام:۷۵] "اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمان وزمین کا ملک دکھاتے ہیں اور تاکہ وہ یقین والوں میں سے ہو جائے!" اس آیت میں ابراہیم علیہ السلام کا وصف یہ بیان کیا گیا ہے کہ "وہ یقین والوں میں سے ہو جائیں" کیوں کہ انہیں مخلوق کے ذریعہ خالق کے وجود پر دلائل قائم کرنے سے علم یقینی حاصل ہو گیا تھا۔

* * *

اختلاف ہے، اس میں سات اقوال ہیں جن میں سے راجح قول یہ ہے کہ اگر اسے دلیل میں غور و فکر کرنے کی مہلت ملی، پر اس نے غور و فکر نہ کیا، تو وہ مومن تو ہو گا، لیکن غور و فکر نہ کرنے کا گناہ بھی اس کے سر ہو گا، اور اگر کسی کو غور و فکر کرنے کی مہلت ہی نہ ملی ہو تو وہ مومن ہو گا اور اس کے سر کوئی گناہ بھی نہیں ہو گا۔ خلاصہ از "تحفۃ المرید فی شرح جوہرۃ التوحید"۔

نبوات

(فصل)

نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا نام اور ان کے اوصاف

محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اللہ کے بندے ہیں جن کو اس نے چن لیا ہے، اس کی امامت کے وہ امین ہیں، جن کو اس نے اختیار کر لیا ہے اور اس کے رسول ہیں، جن سے وہ راضی ہو گیا ہے۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اللہ تعالیٰ کی صفت وحدانیت اور دوسری صفات سے فارغ ہونے کے بعد سید المرسلین صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی نبوت کا بیان شروع کیا، کیوں کہ ایمان شہادتین سے مل کر مکمل ہوتا ہے، اس لیے کہ ایمان نام ہے اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کی معرفت اور رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی لائی ہوئی شریعت کی تصدیق کرنے کا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿قُلْ يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا....فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ﴾ [اعراف:۱۵۸] "آپ فرما دیجیے کہ اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول بن کر آیا ہوں... تو اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ جو نبی امی ہے"۔

"إنَّ محمداً صلی اللہ علیہ وسلم" "بے شک محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم" کا عطف کتاب کی ابتدا میں مذکور "إنَّ اللهَ واحدٌ" "بے شک اللہ ایک ہے" پر کیا گیا ہے۔ اس کی تقدیر عبارت اگر نکالیں تو کچھ اس طرح سے ہوگی: اللہ کی توفیق پر عقیدہ رکھتے ہوئے اس کی توحید کے سلسلے میں ہم کہتے ہیں کہ بلاشبہ اللہ ایک ہے۔۔۔ اور محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اس کے بندے ہیں جن کو اس نے چن لیا ہے۔

آپ نے آقا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی صفت عبدیت کو صفت نبوت سے پہلے بیان کیا، جس کا مقصد

یہ تھا کہ لوگ جب آپ ﷺ کے ہاتھوں پر "خارقِ عادات" معجزات کو ظاہر ہوتے ہوئے دیکھیں تو کہیں اس شبہ میں نہ پڑ جائیں کہ آپ معبود ہیں، جس طرح اس سے پہلے نصاریٰ عیسیٰ علیہ السلام کو مردوں کو زندہ، مادرزاد اندھوں اور کوڑھیوں کو شفا دیتے دیکھ کر انہیں معبود سمجھ بیٹھے تھے۔ اور آپ کی سب سے پہلی نشانی ماں کی گود میں آپ کا کلام کرنا تھا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ آتَانِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا﴾ [مریم: ۳۰] "اس نے کہا بے شک میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب دی اور مجھے نبی بنایا"۔ اس آیت میں بھی کلام کی ابتدا "عبدیت" کے وصف سے کی گئی ہے تاکہ ان کی قوم کو ان کے تعلق سے (معبود ہونے کا) جو شبہ ہونے والا تھا اس کا ازالہ ہو سکے، اس کے باوجود وہ ان کی "عبدیت" کو پیٹھ پیچھے چھوڑ کر، انہیں رب مان بیٹھے۔

[ویسے تو نبی ﷺ کی بہت سی صفات ہیں] پھر بھی یہاں پر صرف صفت "اجتباء اور امانت" کا خاص طور پر ذکر کیا گیا، تاکہ یہ بات ذہن نشین ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ اپنے معجزے صرف اور صرف اسی کے ہاتھ پر ظاہر فرماتا ہے جو امین بھی ہو اور مختار بھی ہو۔ جھوٹے اور بدکردار پر تو بالکل بھی نہیں۔

"مجتبیٰ" کا معنی ہے مختار اور "مرتضیٰ" کا معنی ہے جس کی رسالت سے اللہ تعالیٰ راضی ہو۔

نبی ﷺ خاتم الانبیا اور امام الانبیا ہیں

آپ ﷺ سب سے آخری نبی ہیں۔

اس کی دلیل میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پاک ملاحظہ ہو: ﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِنْ رِجَالِكُمْ وَلَكِنْ رَسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ﴾ [احزاب: ۴۰] "محمد ﷺ تمہارے

مردوں میں کسی کے باپ نہیں، ہاں اللہ کے رسول ہیں اور سب نبیوں کے پچھلے" آقا ﷺ کے خاتم الانبیا ہونے پر عقلی دلیل یہ ہے کہ جب عقلی و نقلی دلائل سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ آپ ﷺ نے جو بھی خبریں دی ہیں ان میں وہ سچے ہیں اور آپ ﷺ نے یہ بھی خبر دی ہے کہ: «میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا»[1]۔ اور یہ بھی فرمایا: «بروزِ حشر سب سے پہلے میں اٹھایا جاؤں گا، میرے بعد ہی سارے لوگ اٹھائے جائیں گے»[2]۔ جو اس بات پر واضح دلیل ہے کہ آپ ﷺ خاتم الانبیا ہیں۔

سارے متقیوں کے امام ہیں۔

کیوں کہ آپ ﷺ کی بعثت اس شان سے ہوئی کہ شرک و گناہ سے مکمل پاک اور دور تھے اور تقوی کا یہی تو معنی ہے کہ ہر طرح کے گناہ سے دور رہنا۔ اسی لیے آپ ﷺ کی امت بھی متقی اور آپ ان متقیوں کے امام ہیں۔ اس میں ایک احتمال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چوں کہ آپ ﷺ نے تمام انبیا کی امامت فرمائی تھی اور وہ سب کے سب متقی تھے، اس طرح سے ہمارے آقا ﷺ کے ماتھے پر امام المتقین ہونے کا سہرا سجا۔

تمام رسولوں کے سردار ہیں۔

کیوں کے احادیث مبارکہ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: «میں بنی آدم کا سردار ہوں»[3]، اور تمام رسول، بنی آدم میں داخل ہیں، لہذا آپ ان سب کے بھی سردار ہوئے۔

---

(۱) أخرجه مسلم (٢٣٥٤)، والترمذي (٢٨٤٠).

(۲) أخرجه مسلم (٢٣٥٤).

(۳) أخرجه مسلم (٢٢٧٨).

حبیبِ رب العالمین ہیں۔

کیوں کہ جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ آپ ﷺ کی امت صرف آپ کی اتباع کی برکت سے اپنے رب کی محبوب بن گئی، جیسا کہ خود اللہ تعالی نے اپنے نبی ﷺ کی زبانی ارشاد فرمایا: ﴿فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ﴾ [آل عمران:۳۱] "تم میری اتباع کرو اللہ تمہیں اپنا محبوب بنالے گا"۔ تو خود نبی اکرم ﷺ کا اللہ تعالی کے یہاں کیا مرتبہ ہو گا! وہ اس کے کتنے محبوب ہوں گے! اس سلسلے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت منقول ہے کہ ایک مرتبہ کی بات ہے کہ صحابہ کی ایک جماعت آپس میں بیٹھ کر علمی بحث ومباحثہ کر رہی تھی، [اتفاق سے] نبی ﷺ بھی ان کی یہ گفتگو سماعت فرمارہے تھے، ان میں سے ایک نے کہا: واہ کتنی عجیب بات ہے کہ اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل بنایا ہے! تو اس پر کسی دوسرے نے کہا: اس سے زیادہ تعجب والی بات تو یہ ہے کہ اس نے موسی علیہ السلام سے خود کلام فرمایا ہے! پھر کسی تیسرے نے اپنی بات رکھی: عیسی علیہ السلام تو کلمۃ اللہ ہیں اور روح اللہ بھی! پھر کسی چوتھے شخص نے کہا: آدم علیہ السلام کو تو اللہ نے چن لیا ہے! یہ سن کر نبی ﷺ ان کے پاس خود بنفس نفیس تشریف لائے اور فرمانے لگے: میں نے تم سب کی باتیں سنیں اور تم سب کی دلیلیں بھی کہ ابراہیم خلیل اللہ ہیں، ہاں وہ ہیں! موسی نجی اللہ ہیں، ہاں وہ تو ہیں! عیسی کلمۃ اللہ اور روح اللہ ہیں، ہاں ہاں وہ ایسے ہی ہیں! اور آدم کو اللہ نے چن لیا ہے، ہاں ہاں اس نے انہیں چن لیا ہے۔ اب ذرا میرے بارے میں بھی سن لو! میں اللہ کا محبوب ہوں اور مجھے اس پر کوئی غرور نہیں، آدم اور ان کے بعد آنے والے سارے لوگ بروز قیامت میرے جھنڈے تلے ہوں گے، جب لوگ اٹھائے جائیں گے تو ان میں سب سے پہلے میں اٹھایا جاؤں گا، جب وہ سب [رب ذوالجلال کے سامنے کھڑے ہوں گے] تو ان میں ایک اکیلا میں ہوں گا جو [اپنے رب سے] کلام کروں گا اور میں اپنے رب کے نزدیک

اولاد آدم میں سب سے زیادہ عزت وشرف والا ہوں اور اس پر مجھے کوئی غرور وتکبر نہیں ہے۔[1]

ان کی نبوت کے بعد نبوت کا ہر دعوی گمراہی اور نفس پرستی پر مبنی ہوگا!

کیوں کہ جب یہ بات نص قطعی سے ثابت ہوگئی کہ وہ خاتم النبیین ہیں اور ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، پھر بھی اگر کوئی شخص ان کے بعد نبوت کا دعوی کرے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ نص قطعی کو جھوٹا ثابت کرنا چاہتا ہے، جو کہ اپنے آپ میں کھلی ہوئی گمراہی ہے۔ جب کوئی سیدھی راہ سے بھٹک جائے تو اس کے بارے میں اہل عرب کہتے ہیں: "غَوَىٰ، يَغْوِي، غَيّاً" یعنی وہ گمراہ ہوگیا۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ﴾[بقرہ:۲۵۶] "یعنی ہدایت گمراہی سے، ایمان کفر سے اور حق باطل سے واضح ہوگیا"۔ اور "ھوی" کا معنی ہے: شہوتِ نفسانیہ، اور نفس کا باطل کی طرف مائل ہونا۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ﴾[نازعات:۴۰] "اور نفس کو شہوت سے روکے رکھا"۔ لہذا نبی آخر الزماں کے بعد اگر کوئی نبوت کا دعوی کرے تو اس دعوے کے پیچھے شہوات نفسانیہ کی کارستانیاں ہی کار فرما ہوں گی، وہ دلیل کہاں سے لائے گا!؟ اس لیے اس کا یہ دعوی باطل ہی رہے گا۔

وہ تمام جن اور تمام مخلوق کی طرف بھیجے گئے ہیں، اس لیے وہ جن وانس سب کے رسول ہیں۔

[قیامت تک کے] تمام انسانوں کے لیے ان کے مبعوث ہونے کی دلیل یہ آیات

---

(۱) أخرجه الترمذي (٣٦١٦).

ہیں: ﴿قُلْ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِنِّى رَسُولُ ٱللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا﴾ [اعراف:۱۵۸]"آپ فرمادیجیے کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں"۔ ﴿وَمَآ أَرْسَلْنَـٰكَ إِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ﴾ [سبأ:۲۸]"ہم نے آپ کو تمام لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا"۔ انہیں آیتوں میں بعض یہودیوں کے اس گمان کا رد بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت صرف اہل عرب کے لیے ہی ہے۔

اور رہ گئی ان کے تمام جنوں کی طرف بھیجے جانے کی دلیل تو وہ بھی ان آیتوں میں موجود ہے:﴿قُلْ أُوحِىَ إِلَىَّ أَنَّهُ ٱسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ ٱلْجِنِّ فَقَالُوٓا۟ إِنَّا سَمِعْنَا قُرْءَانًا عَجَبًا يَهْدِىٓ إِلَى ٱلرُّشْدِ فَـَٔامَنَّا بِهِۦ﴾[جن:۱،۲]"آپ فرمادیجیے: مجھ پر وحی نازل ہوئی ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے قرآن کو سن کر کہا ہم نے بہت عجیب قرآن سنا جو سیدھی راہ چلاتا ہے تو اس پر ہم ایمان لے آئے"۔ ﴿وَأَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا ٱلْهُدَىٰٓ ءَامَنَّا بِهِۦ﴾ [جن:۱۳]"جب ہم نے ہدایت کو سنا تو اس پر ایمان لے آئے"۔

حق وہدایت اور نور وروشنی لے کر آئے۔

"بالحق" میں باء کا تعلق گزشتہ عبارت "وہو المبعوث" سے ہے، جس کی تقدیر کچھ اس طرح سے ہوگی:**هو المبعوثُ بالحق الذي لأجله خُلقَتِ السماواتُ والأرضُ** "یعنی رسول اللہ ﷺ وہ حق لے کر آئے جو آسمان وزمین کی تخلیق کا مقصد تھا"۔ اور یہ مقصد ہے وحدانیت باری تعالی کا ثبوت فراہم کرنا، اوامر پر عمل کرکے اور نواہی سے باز آکر کے اس کی پرستش کرنا اور فنا کے بعد دار البقا میں جزا کے لیے اٹھایا جانا۔

اور اس میں اس بات کا بھی احتمال ہے کہ "بالحق" سے فرائض وواجبات کی شکل میں جو بندوں پر اللہ کا حق ہے اور اسی طرح ان میں ایک دوسرے پر ایک دوسرے کے جو حقوق ہیں، وہ مراد ہوں۔

اور "ہدی" کا معنی ہے: وہ رہنمائی جو منزل مقصود تک پہنچادے۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہدایت ضلالت کے مقابلے میں وارد ہوئی ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿أُوْلَـٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ ٱشْتَرَوُاْ ٱلضَّلَـٰلَةَ بِٱلْهُدَىٰ﴾ [بقرہ:۱۶] "وہ جنہوں نے ہدایت کے بدلے میں گمراہی خریدی"۔ اس سلسلہ میں ایک ضعیف قول یہ بھی ملتا ہے کہ ہدی کا معنی ہے بیان۔ اس معنی کے پیشِ نظر اس عبارت کا مطلب ہوگا کہ وہ خلق خدا کو راہ حق بتانے کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ ارشاد باری تعالی ہے: "﴿وَإِنَّكَ لَتَهْدِيٓ إِلَىٰ صِرَٰطٍ مُّسْتَقِيمٍ﴾ [شوری:۵۲] "اور بے شک آپ سیدھی راہ دکھاتے ہیں"۔

اور نور وروشنی سے مراد شریعت ہے، جو قرآن اور اس جیسے حق وصداقت پر مبنی قطعی دلائل کے ذریعہ ظاہر ہو چکی ہے۔ نور اور قرآن کے درمیان "وجہ شبہ "ظاہر ہے، کیوں کہ دونوں سے ہی منزل کا سراغ ملتا ہے۔ اور نور ہر روشنی بخشنے والی چیز کی روشنی کو کہتے ہیں جو کہ ظلمت کی نقیض ہے"۔ اضاءت "کا اطلاق "انارت "یعنی "روشنی بخشنے" کی اعلی حد پر ہوتا ہے لہذا ضوء میں نور سے زیادہ معنویت ہے، اس کا مصداق اللہ تعالی کا یہ قول ہے: ﴿هُوَ ٱلَّذِي جَعَلَ ٱلشَّمْسَ ضِيَآءً وَٱلْقَمَرَ نُورًا﴾ [یونس:۵] "وہی ہے جس نے سورج کو ضیاء بخشی اور چاند کو نور"۔

قرآن اللہ تعالی کا کلام قدیم ہے

بے شک قرآن اللہ عز و جل کا کلام ہے جو بلا کیفیت قول کی شکل میں اس کی بارگاہ سے ظاہر ہوا، جسے وحی کی شکل میں اس نے اپنے نبی ﷺ پر نازل فرمایا اور ہر اہلِ ایمان نے اس کی حقانیت کی تصدیق کی۔

چوں کہ شریعت کا سارا دار و مدار قرآن پر ہے اور یہ نبوت کی صداقت پر دلالت کرنے والا سب سے عظیم معجزہ بھی ہے، اس لیے توحید و نبوت کے بیان سے فارغ ہونے کے بعد قرآن کے متعلق کس طرح کا عقیدہ رکھنا چاہئے اس بیان کو شروع کیا جب کہ لوگوں کا اس کے متعلق شدید اختلاف رہا ہے، اسی لیے جو حق تھا اس کو بیان کرنا ضروری تھا، اسی کے پیش نظر امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: **"بلاشبہ قرآن اللہ کا کلام ہے"**۔ جس کا عطف مذکورہ قول: **"بے شک اللہ ایک ہے"**۔ پر کیا گیا ہے، تقدیر عبارت کچھ اس طرح کی ہوگی: "نقولُ مُعْتَقِدِينَ إنَّ اللهَ واحدٌ، وإن محمدا عبدُه المصطفى، وإنَّ القرآنَ كلامُ اللهِ" **"ہمارا عقیدہ ہے کہ بلاشبہ اللہ ایک ہے، محمد ﷺ اس کے بندے ہیں جنہیں اس نے (اپنی رسالت کے لیے) چن لیا ہے اور قرآن اللہ کا کلام ہے"**۔

ارشاد باری تعالی ہے: ﴿حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ﴾ [توبہ:۶] "یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے"۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿يُرِيدُونَ أَنْ يُبَدِّلُوا كَلَامَ اللَّهِ﴾ [فتح:۱۵] "وہ اللہ کا کلام بدلنا چاہتے ہیں"۔

کلام الٰہی سے کیفیت کی نفی کا مقصد یہ تھا کہ معتزلہ اور کرامیہ کے برخلاف اس کے کلام کی ازلیت کو ثابت کر سکیں اور حنابلہ کے برخلاف حروف و اصوات کی جنس سے اس کی

تنزیہ بیان کر سکیں اس لیے کہ اگر وہ حادث ہوتا تو اس کا حدوث یا تو ذات باری تعالی میں ہوا ہوتا، جیسا کہ کرامیہ کا عقیدہ ہے، لیکن اس میں مشکل یہ تھی کہ اس طرح سے اس کی پاک ذات حوادث کا محل بن جاتی، جو کہ عقلی وشرعی کسی بھی طریقے سے ممکن نہیں، یا سرے سے اس کا حدوث کسی محل میں ہوا ہی نہ ہوتا اور یہ بھی محال ہے، کیوں کہ کلام "عرض" ہے لہذا وہ کسی نہ کسی محل یعنی مکان کے ساتھ ہی قائم ہوگا، یا پھر اس کی ایک تیسری صورت یہ ہوتی کہ ذات پاک کو چھوڑ کر کسی دوسرے محل میں اس کا حدوث ہوتا، لیکن اس صورت کی سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ اس طرح سے باری تعالی کو چھوڑ کر وہی دوسرا محل متکلم بن جاتا۔

اس سلسلے میں حنابلہ [1] کی یہ بات بھی سرے سے باطل ہے کہ کلام باری تعالی ایسے حروف پر مشتمل ہے جو غیر مخلوق ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی ذات کے ساتھ قائم ہیں، کیوں کہ حروف کا مطلب ہی یہی ہے کہ وہ پے درپے وجود میں آتے ہیں، جن میں ہر ایک حرف اپنے پہلے والے حرف سے وجود میں مؤخر ہوتا ہے، اور جو مؤخر ہو جائے وہ حادث ہے۔ اس کے بطلان کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ لب و حلق جیسے آلات سے ہی وجود میں آتے ہیں، جس سے "تجسیم" لازم آئے گی جس سے اللہ تعالی بلند وبالا ہے۔

اور یہ جو امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: **" جسے وحی کی شکل میں اس نے اپنے**

---

(۱) یہ ایک جماعت ہے جو فروع میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی اتباع کرتی ہے، لیکن اصول میں ان کے خلاف ہے، ان کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالی کا کلام حروف و آواز پر مشتمل ہے، لیکن قدیم ہے، بعض لوگوں نے تو یہاں تک غلو کر دیا کہ قرآن کریم کے وہ حروف جن کو ہم ادا کرتے ہیں اور جو کلام مجید میں لکھے ہوئے ہیں وہ بھی قدیم ہیں۔ امام احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ ان سے بری ہیں۔

نبی ﷺ پر نازل فرمایا" اس کی دلیل میں یہ ارشاد باری تعالیٰ ملاحظہ ہو: ﴿وَأُوحِىَ إِلَىَّ هَٰذَا ٱلْقُرْءَانُ لِأُنذِرَكُم بِهِۦ وَمَنۢ بَلَغَ﴾ [انعام:۱۹] "مجھ پر اس قرآن کی وحی اس لیے کی گئی ہے تاکہ میں تمہیں اور جن تک یہ پہنچے انہیں ڈراؤں"۔ اسی سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ملاحظہ کیجئے: ﴿هُوَ ٱلَّذِىٓ أَنزَلَ عَلَيْكَ ٱلْكِتَٰبَ﴾ [آل عمران:۷] "وہی ہے جس نے آپ پر یہ قرآن نازل کیا" پھر آگے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: **"اور ہر اہل ایمان نے اس کے حق ہونے کی تصدیق کی"**۔ اس کا سبب یہ ہے کہ چوں کہ صحابہ کرام نے رسول پر قرآن کے نازل ہونے کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا، اس کے اعجاز کی تحقیق (اپنی فطری عربی دانی سے کی، جو کہ ان کے خمیر میں گندھی ہوئی تھی) اور اس کے کلام الٰہی ہونے کی تصدیق اپنے دل سے کی، پھر جس طرح سے انہوں نے اس کو نبی کریم ﷺ سے تواتر کے ساتھ نقل کیا تھا اسی طرح سے اپنے بعد والوں تک تواتر کے ساتھ کچھ اس طرح نقل کیا کہ اس میں ایک نقطے کی بھی فروگزاشت ان سے نہیں ہوئی، اور پوری مخلوق کو اس بات کی دعوت دی کہ عملی واعتقادی دونوں میدانوں میں اس کی تطبیق کریں اور یہ سب کارنامے اس قرآن کی تصدیق کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

ان مومنوں کو اس بات کا یقین ہے کہ وہ حقیقی معنوں میں اللہ عزوجل کا کلام ہے۔

یعنی انہیں اس بات پر علم الیقین حاصل ہو گیا ہے کہ علم وحیات اور دوسری صفات کی طرح حقیقی معنوں میں قرآن اللہ کا کلام ہے، اس میں "معتزلہ" کا رد ہے کیوں کہ ان کا یہ ماننا ہے کہ قرآن کو اللہ کا کلام مجازی معنوں میں کہا جاتا ہے اس لیے کہ وہ اس کا خالق ہے۔ ہم اہل سنت وجماعت کا اس پر یہ کہنا ہے کہ یہ بات فساد پر مبنی ہے کیوں کہ متکلم

اسے کہتے ہیں جس کے ساتھ صفت کلام قائم ہو اور وہ صفت کلام کے ساتھ متصف ہو، نہ کہ اسے جس نے کلام کو پیدا کیا ہو، جس طرح سے عالم وہ ہے جو صفت علم سے متصف ہو، نہ کہ جس نے دوسرے میں صفت علم کو پیدا کیا ہو۔ کیوں کہ اگر اللہ تعالی کو صرف اس بنا پر صفت کلام سے متصف مانا جائے کہ اس نے اس کلام کو پیدا کیا ہے، اگرچہ وہ اس کی ذات کے ساتھ قائم نہیں ہے، تب تو پھر کالے اور اس کے علاوہ دوسرے رنگوں سے بھی اس کو متصف ماننا چاہئے کیوں کہ ان کو بھی اسی نے پیدا کیا ہے!۔

جس نے قرآن کو سنا اور یہ خیال کیا کہ یہ تو بشر کا کلام ہے تو وہ کافر ہو گیا۔

منافقین قرآن پر یہ تہمت لگاتے تھے کہ یہ تو محمد ﷺ کا خود ساختہ کلام ہے، اس کا وحی ربانی سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ سابقہ عبارت میں امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی اسی تہمت کا رد فرمایا ہے۔ ان منافقین کی اس تہمت پر اللہ تعالی نے بھی ان کی مذمت فرمائی اور انہیں سقر یعنی عذاب جہنم کی وعید سنائی، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿إِنْ هَٰذَآ إِلَّا قَوْلُ ٱلْبَشَرِ ۝٢٥ سَأُصْلِيهِ سَقَرَ﴾ [مدثر:۲۵،۲۶] "یہ تو بشر کا قول ہے، عن قریب میں اس کو جہنم پہنچادوں گا"۔

جب اللہ تعالی نے یہ وعدہ کیا ہے کہ جو اس کے بارے میں یہ کہے گا کہ "یہ تو بشر کا کلام ہے"۔ [مدثر:۲۵] تو وہ اس کو جہنم رسید کردے گا، تو اسی سے ہمیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہو نہ ہو یہ خالق بشر کا ہی کلام ہے، جس کو بشر کے کلام سے ذرہ برابر بھی مشابہت نہیں ہے۔ جس نے اللہ تعالی کو کسی بشری وصف سے موصوف کیا تو وہ کافر ہو گیا پر جسے بصیرت مل گئی وہ سمجھ گیا اور اس طرح کا کفریہ کلام کبھی بھی اپنی زبان پر نہیں لایا۔

یہ پورا کا پورا کلام اس بات پر مشتمل ہے کہ اس سے پہلے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کلام

الٰہی سے حادث ہونے اور مخلوق کے کلام کی طرح اس کے حروف واصوات کی جنس سے ہونے کی جو نفی کی تھی یہ اسی کی تاکید ہے، کیوں کہ جس نے بھی یہ کہا کہ قرآن مخلوق وحادث ہے یا جس نے یہ عقیدہ رکھا کہ وہ حروف واصوات کی قبیل سے ہے تو در حقیقت اس نے باری تعالیٰ کو بشری صفات سے متصف جانا، لہٰذا ان کے اس کلام میں اور کفار کے کلام میں کہ یہ تو بشر کا کلام ہے، کوئی فرق نہیں ہوگا، کیوں کہ اس میں خالق کو مخلوق سے تشبیہ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو بھی ان معانی میں غور وفکر کرے گا اس کو ان معانی کے سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگے گی اور وہ اس کفریہ کلام سے باز آجائے گا۔

اور اس پر اس حقیقت کے دریچے کھل جائیں گے کہ اللہ تعالیٰ اپنی صفات میں بشر کی کسی بھی صفت کی طرح نہیں ہے۔

کیوں کہ اس کی صفات قدیم ہیں، جو کہ اس کی ذات کے ساتھ ہی قائم ہیں اور ان پر کبھی بھی زوال نہیں آئے گا، برخلاف بشر کی صفات کے جو کہ ان کی ذات ہی کی طرح حادث ہیں اور زوال وفنا، کیفیات وکمیات، ان کی صفات کا خاصہ ہے۔ اور رہی بات اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی تو وہ ان سب چیزوں سے بلند وبالا ہے: ﴿لَيۡسَ كَمِثۡلِهِۦ شَيۡءٞ﴾ [شوریٰ:۱۱] "اس کی طرح کچھ بھی نہیں ہے"۔

اللہ تعالیٰ کا دیدار حق ہے

جنتیوں کے لیے (اللہ تعالیٰ کا) دیدار حق ہے (اور یہ دیدار ایسا ہوگا کہ اس میں ذات باری تعالیٰ کا) نہ تو احاطہ ہوگا اور نہ ہی کسی طرح کی کوئی کیفیت ہوگی، جیسا کہ اس پر ہمارے رب کی کتاب ناطق ہے: ﴿وُجُوهٞ يَوۡمَئِذٖ نَّاضِرَةٌ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٞ﴾ [قیامہ:۲۲،۲۳] "اس

دن ان کے چہرے کھلے ہوں گے وہ اپنے رب کا دیدار کر رہے ہوں گے"۔اس کی تفسیر اوراس کی مراد اللہ تعالیٰ کے علم کے سپرد ہے اور اس سلسلے میں جو بھی رسول اللہ ﷺ سے صحیح احادیث وارد ہوئی ہیں وہ ویسی ہی ہیں جیسی آپ ﷺ نے بیان فرمائیں اور اس کا معنی وہی ہے جو آقا ﷺ نے مراد لیا۔

اس عبارت سے ان کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ نیکوں کے لیے جنت میں آنکھوں سے دیدار الٰہی کرنا حق ہے، اس لیے وہ اس کا دیدار کریں گے، لیکن اس دیدار کی صورت یہ ہو گی کہ نہ تو وہ کسی مکان میں ہو گا، نہ کسی جہت میں ہو گا، نہ کسی شعاع کا اتصال اس کے لیے ضروری ہو گا اور وہاں پر (دیدار کے لیے) نہ ہی یہ دنیاوی قاعدہ لازم ہو گا کہ دیکھنے والے کے درمیان اور اللہ تعالیٰ کے درمیان مسافت ضروری ہے، یہی ان کے قول: ولا کیفیۃ (بغیر کسی کیفیت کے) سے مراد ہے۔ حاصل کلام یہ کہ اصل رویت (دیدار) کا اعتقاد رکھا جائے اور اس کی کیفیت میں پڑنے سے بچا جائے۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے "نہ تو احاطہ ہو گا" کی قید لگائی کیوں کہ احاطے کا معنی ہے: اطراف وجوانب کا ادراک کرنا اور یہ اللہ تعالیٰ کے لیے محال ہے، کیوں کہ وہ کوئی جسم نہیں ہے کہ اس کے لیے کوئی انتہا ہو اور وہ اس انتہا کے ذریعہ جانا جاسکے! اللہ تعالیٰ کے اس کلام پاک کا یہی معنی ہے: ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ﴾ [انعام:۱۰۳] "نگاہیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں اور وہ نگاہوں کا احاطہ کرتا ہے۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے سابقہ قول: "کیوں کہ اس پر ہمارے رب کی کتاب ناطق ہے"۔کا بیان اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پاک میں ہے: "﴿وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿٢٢﴾ إِلَىٰ

رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾ [قیامہ:۲۲،۲۳] "اس دن چہرے کھلے ہوں گے وہ اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے"۔ اور اس کی تفسیر وہی ہے جو اللہ تعالی کی مراد ہے۔

اور وہ نظر جس کا انتساب کلمہ "الی" کے ذریعہ وجہ یعنی چہرے کی طرف کیا ہے اس نظر سے مراد آنکھوں والی نظر ہی ہو گی لہذا نظر کو انتظار کے معنی پر محمول کرنا، جو کہ دار القرار کی نعمتوں کے مزے کو پھیکا کر دینے کے مترادف ہے، نہایت ہی قبیح ہے۔

[اس پر بہت ساری آیات واحادیث شاہد ہیں] موسی علیہ السلام کی زبانی اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے: ﴿رَبِّ أَرِنِيٓ أَنظُرۡ إِلَيۡكَ﴾ [اعراف:۱۴۳] "اے میرے رب مجھے اپنا جلوہ دکھا کہ میں تجھے دیکھوں"۔ اس آیت سے استدلال کی وجہ یہ بنی کہ موسی علیہ السلام نے اپنے رب سے اس کا دیدار طلب کیا اور ہمیں نہیں لگتا کہ وہ کوئی ایسی چیز طلب کر سکتے ہیں جو ان کے نزدیک محال ہو! لہذا ان کی یہ طلب ہی اپنے آپ میں ان کے اس عقیدے کی دلیل ہے کہ رویت یعنی دیدار فی ذاتہ ممکن ہے۔ جس نے بھی رویت کو محال مانا تو گویا اس نے در پردہ موسی علیہ السلام کی جانب یہ بات منسوب کی کہ وہ خالق کو نہیں جانتے تھے جو کہ کفر ہے۔

ارشاد باری تعالی ہے: ﴿لِّلَّذِينَ أَحۡسَنُواْ ٱلۡحُسۡنَىٰ وَزِيَادَةٞ﴾ [یونس:۲۶] "جس نے بھلائی کی اس کے لیے جنت اور اس سے بھی بڑی نعمت ہے"۔ یہاں پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے[1] "الحسنی" کی تفسیر جنت سے کی ہے اور "زیادۃ" کی تفسیر رویت باری تعالی سے کی ہے۔

ارشاد باری تعالی ہے: ﴿تَحِيَّتُهُمۡ يَوۡمَ يَلۡقَوۡنَهُۥ سَلَٰمٞ﴾ [احزاب:۴۴] "جس دن وہ

(۱) أخرج مسلم (۱۸۱).

اس سے ملیں گے وہ ان سے سلام کرے گا"۔اور یہ لقاء یعنی ملنا در حقیقت رویت ہی ہو گی۔

ارشاد باری تعالی ہے:"﴿كَلَّآ إِنَّهُمۡ عَن رَّبِّهِمۡ يَوۡمَئِذٖ لَّمَحۡجُوبُونَ﴾ [مطففین: ۱۵]"اس دن اپنے رب کو دیکھنے سے ان کی نگاہوں پر پردہ ڈال دیا جائے گا"۔لہٰذا کافروں کو پردے کے ساتھ خاص کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس دن اہل ایمان کی آنکھوں پر پردا نہیں ہو گا، ورنہ نیکوکار اور کفار آنکھوں پر پردا پڑنے میں برابر ہو جائیں گے!رویت باری تعالی پر دلالت کرنے والی اسی طرح کی اور بھی بے شمار آیتیں ہیں۔

اس پر احادیث صحیحہ بھی ہیں جیسا کہ اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ سے صحیح روایت ہے: بے شک تم سب بروز قیامت اپنے رب کو اس طرح دیکھو گے جس طرح چودھویں کے چاند کو دیکھتے ہو، اس کا دیدار کرنے میں تم لوگ ایک دوسرے پر ڈھے نہیں پڑ رہے ہو گے [1]۔ اس سے نبی ﷺ کی مراد یہ ہے کہ جس طرح سے چودھویں کا چاند دیکھ کر کوئی اس میں شک نہیں کرتا اور نہ ہی کوئی اختلاف کرتا ہے اسی طرح دیدارِ الٰہی کے بعد کوئی اس میں شک نہیں کرے گا اور نہ ہی اختلاف۔ اسی وجہ سے شک اور اختلاف نہ ہونے میں رویتِ باری تعالی کو رویتِ ماہ کامل سے تشبیہ دی گئی ہے نہ کہ ایک "مرئی" یعنی ذات باری تعالی کو دوسری "مرئی" یعنی ماہ کامل سے تشبیہ دی گئی ہے۔

اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد بھی ملاحظہ فرمایئے:"جب اہل جنت جنت میں داخل ہو جائیں گے تو اللہ تبارک وتعالی ان سے پوچھے گا: کیا تم ان نعمتوں کے بعد

---

(۱) أخرجه البخاري (٥٥٤).

بھی مزید کوئی نعمت چاہتے ہو؟ اس پر وہ عرض کریں گے: اے ہمارے رب! کیا تو نے ہمارے چہرے پُر نور نہیں کیے!؟ کیا تو نے ہمیں جنت میں نہیں داخل کیا!؟ کیا تو نے ہمیں جہنم سے نجات نہیں دی!؟ اب اس سے زیادہ ہمیں اور کیا چاہیئے!؟ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: پھر اللہ تعالی ان کے درمیان اور اپنے درمیان پڑے ہوئے حجاب کو ہٹادے گا، اس وقت ان کی نگاہوں میں ایک رب تبارک وتعالی کے دیدار کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں بچے گی"[1]۔

فَيَنسونَ النعيمَ إذا رأوه * فيا خُسرانَ أهلِ الاعتزالِ

وہ اسے دیکھ کر جنت ہی بھول بیٹھیں گے * ہائے اہلِ اعتزال کے خسارے کو کیا کہیے؟

اس میں ہم اپنی رائے سے نہ تو کوئی تاویل کریں گے اور نہ ہی ہوائے نفس کا شکار ہو کر کسی طرح کے وہم میں پڑیں گے۔

یہ عبارت معتزلہ کے تردید میں ہے، کیوں کہ انہوں نے اللہ تعالی کے قول: ﴿إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾ "کی تاویل کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہاں پر کلمہ "إلى" "الآلاء" کا مفرد ہے، جس کا معنی ہوتا ہے "نعمت" جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿فَبِأَيِّ ءَالَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ﴾ ۔۔۔[رحمن: ۱۳] "تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟" اس لیے مذکورہ آیت میں لفظ "نظر" میں جو "الی" ہے یہ حرف والا نہیں ہے، اب اس پوری آیت کا معنی یہ ہوگا کہ اس دن چہرے اپنے رب کی نعمتوں کو دیکھ رہے ہوں گے اور ان کا

---

(۱) أخرج مسلم (۱۸۱).

انتظار کر رہے ہوں گے۔ یہ تاویل بعید ہونے کے ساتھ ساتھ فاسد بھی ہے، کیوں کہ نظر کو انتظار کے معنی پر محمول کرنا کسی بھی طرح سے درست نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ دار القرار (جنت) میں انتظار کرنا حزن و الم کا باعث ہے، اس لیے کہ انتظار کو "سرخ موت" سے تعبیر کیا گیا ہے اور ان کو اس تاویل فاسد پر ان کے وہم باطل اور ہوائے قاتل نے ابھارا ہے، کیوں کہ یہاں پر وہ واضح اور سیدھے راستے کو چھوڑ کر ہوائے نفس کے ٹیڑھے میڑھے راستے پر چل پڑے۔

کیوں کہ دین میں وہی محفوظ رہ پایا ہے جس نے اپنے آپ کو مکمل طور پر اللہ عزوجل اور اس کے رسول ﷺ کے حوالے کر دیا اور پھر جس چیز کی گتھیاں اس پر نہ کھل سکیں تو اس کے علم کو "علام الغیوب" پر چھوڑ دیا۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بات اس لیے کہی کیوں کہ اگر یہ ثابت ہو گیا کہ یہ چیز اللہ و رسول کی طرف سے آئی ہے تو اب یہاں پر ہر اہل ایمان کا ایمانی فریضہ ہے کہ "آمَنَّا وصَدَّقنا" کہہ کر اس کے سامنے سر جھکا دے، چاہے اسے اس کی حکمت معلوم ہو یا نہ ہو! اس بات کو صرف اس وجہ سے رد نہ کر دے کہ ہمیں اس کا علم نہیں ہے، کیوں کہ بشری عقل میں اتنی بساط کہاں کہ وہ اللہ تعالی کی حکمتیں سمجھ سکے! کیوں کہ عقل بھی اسی عالم کا ایک جزو ہے، پھر بھلا وہ اللہ تعالی کی حکمتوں کا احاطہ کرے بھی تو کیوں کر!؟ اس لیے جس کو بھی اپنے دین کی سلامتی پیاری ہے اس پر ضروری ہے کہ وہ علم کی الجھی ہوئی گتھیوں کو اللہ تعالی کے سپرد کر دے، کیوں کہ ایک وہی ذات ایسی ہے جو ہر چیز کی حقیقت سے آگاہ ہے اور "متشابہات" کی تاویل کرنے میں سکوت کا موقف اختیار کرے۔

کچھ لوگوں نے اپنی رائے سے تاویل کی جس کے نتیجے میں وہ صفات کی نفی اور ان کی

تعطیل کر بیٹھے۔ وہیں پر کچھ لوگوں نے ان کو ان کے ظاہری معنی پر محمول کیا جس کے نتیجے میں وہ تشبیہ و تجسیم جیسے گڑھے میں جا گرے اور "مُعطِّلہ و مُجسِّمہ" کہلائے! متشابہات پر پختہ ایمان رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ تاویل چھوڑ کر اللہ تعالی کے اس قول پر پہنچ کر وقف کرلیں اور رک جائیں: ﴿وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُۥٓ إِلَّا ٱللَّهُ﴾ [آل عمران:۷] "اللہ کے سوا اس کی تاویل کوئی نہیں جانتا"۔ یہی سلَف کرام کا مذہب ہے جو کہ خلف یعنی متاخرین کے مذہب سے زیادہ سلامتی والا ہے کہ ان متاخرین نے تاویل کرنے میں اس طرح سے میانہ روی اختیار کی کہ جس سے نہ تو تشبیہ لازم آئے اور نہ ہی تعطیل۔[1]

---

(۱) کہا جاتا ہے: "مذهب السلف اسلم ومذهب الخلف احكم" "یعنی متشابہات کی تاویل میں سلف کا راستہ "اسلم" زیادہ محفوظ ہے، کیوں کہ اس میں یہ خوف نہیں ہے کہ کہیں تاویل میں قدم بہکے اور تنزیہ کی بجائے باری تعالی کی طرف کسی ایسے معنی کا انتساب نہ کردے جو اس کی شان کے لائق نہ ہو۔ اور خلف کا مذہب "احکم" یعنی زیادہ مضبوط ہے، کیوں کہ اس طریقے سے ان تمام شبہات کا رد ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے وہ معانی جو ذات باری تعالی کے لیے قرآن وحدیث سے ثابت ہیں معتزلہ جیسے فرقے اللہ تعالی کی ذات وصفات سے ان کی نفی کرتے ہیں، اسی طرح ذات باری تعالی سے ان تمام معانی کی تنزیہ بھی ہو جاتی ہے جن معانی کو اہلِ تشبیہ و تجسیم اپنی ہوائے نفس کی پیروی میں اللہ تعالی کے لیے ثابت کرنا چاہتے ہیں، جب کہ اللہ تعالی ان سے پاک ہے اور وہ معانی اس کے لیے محال ہیں۔

یہاں پر ایک فرق سمجھنا نہایت ضروری ہے، جس فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے "اہل تشبیہ و تجسیم" جن کی نمائندگی عصر حاضر میں اپنے آپ کو "سلفی اور وہابی" کہلانے والے لوگ کر رہے ہیں، عوام کو اس مغالطے میں ڈالتے ہیں کہ آیات متشابہات کے سلسلے میں سلف صالحین یعنی صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کا مذہب "تفویض" یعنی اس کی مراد اللہ تعالی کے علم کے سپرد کر دینا تھا، اس کے بعد ان کا دوسرا قدم یہ ہوتا ہے: لہذا "ید" سے مراد "ید حقیقی" یعنی حقیقی ہاتھ مان لو، "وجہ" سے مراد "وجہ حقیقی" یعنی حقیقی چہرہ مان لو! انصاف کے لیے یہ بھی بتاتے چلیں تاکہ کوئی ہم پر علمی بے ایمانی کا الزام نہ لگا سکے، کہ یہ سلفی

حضرات جن کی متشابہات کی تفویض یا تاویل کے سلسلے میں سلفیت کی حد ابن تیمیہ صاحب پر جا کر رک جاتی ہے، وہ اللہ تعالی کے لیے حقیقی ہاتھ یا حقیقی چہرہ ثابت کرنے کے بعد اس بات کا اقرار بھی کرتے ہیں کہ اس کا یہ حقیقی ہاتھ یا حقیقی چہرہ ہمارے چہرے کی طرح نہیں ہے۔ اس سے آپ کو ان کی بات میں تضاد صاف نظر آرہا ہوگا کہ جب اللہ تعالی کا ہاتھ ہمارے ہاتھ کی طرح نہیں ہے، تو پھر اس کے لیے حقیقی ہاتھ کے ثبوت کا کیا مطلب!؟ وہ تو مجازی ہو گیا، اور اگر اس کے لیے حقیقی ہاتھ ثابت ہے تو پھر ہمارے ہاتھ کی طرح نہ ہونے کا کیا معنی رہ جاتا ہے! واللہ الھادی وھو المستعان!

اب ان کے اس علمی مغالطے کا بھی ذرا جائزہ لے لیں! عمومی طور پر یہ بات کہنا کہ متشابہات کے سلسلے میں سلف کا مذہب تفویض ہے اور خلف کا مذہب تاویل ہے، درست نہیں ہے، جب کہ اس سلسلے میں ہمارے بہت سے بھائیوں سے بھی تسامح ہوا ہے! درست قول یہ ہے کہ اکثر سلف کا مذہب "تفویض" ہے اور اکثر خلف کا مذہب "تاویل" ہے، کیوں کہ سلف میں سے بعض کا مذہب تاویل بھی ہے۔ جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے اللہ تعالی کے قول: "وَجَاءَ رَبُّكَ" "اور تمہارا رب آیا" [فجر: ۲۲] کی تاویل میں فرمایا" أی امرُ ربک "یعنی تمہارے رب کا حکم آیا"۔ (تفسیر قرطبی، تفسیر نسفی)۔ اسی طرح خلف میں سے بھی بعض کا مذہب تفویض رہا ہے، جیسے کہ ماتریدی حضرات کہ ان میں سے عقائد کے باب میں، جن علما پر اعتماد ہے، ان سب کا مذہب تفویض ہی ہے۔

(مستفاد از کلام استاذ محترم و شیخ مکرم شیخ احمد محمود الشریف حنفی ماتریدی مصری)

پھر ان میں سے بھی جن لوگوں نے تفویض کا موقف اختیار کیا ہے اب چاہے وہ سلف ہوں یا خلف، پہلے وہ اس معنی سے جو نصوص کے ظاہر سے ثابت ہو رہا ہے اور اللہ تعالی کے لیے محال و نقص ہے، اللہ تعالی کی تنزیہ کرتے ہیں، پھر اس نص سے کون سا معنی حقیقت میں مراد ہے اس کی تعیین اللہ تعالی کے علم کے سپرد کر دیتے ہیں، جو کہ ایک طرح کی تاویل ہی ہے، لیکن امام دردیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو "**تاویل خفی**" سے تعبیر کیا ہے۔ اور خلَف پہلے اللہ تعالی کی ذات اقدس سے اس ظاہری معنی کی تنزیہ کرتے ہیں، پھر ظنی طور پر اس کے معنی کی تعیین کرتے ہیں، اس شرط کے ساتھ کہ وہ معنی اصول اسلام سے نہ ٹکرا رہا ہو، عربی زبان میں اس کا کہیں نہ کہیں ثبوت ملتا ہو، اس کے قواعد و اصول کی اس میں مخالفت نہ ہو، اس تاویل میں ہوائے نفس شامل نہ ہو، بلکہ نصوص شرعی کا دفاع اور مخالفین کے اعتراضات و شبہات کا قلع قمع کرنا مقصود

اور اسلام کا قدم قبول و تسلیم کی پیٹھ پر (اور اس کی اساس پر) ہی ثابت رہ سکتا ہے۔

اس لیے کہ اسلام کا مطلب ہی یہی ہے کہ جس چیز کے بارے میں یہ معلوم ہو جائے کہ وہ اللہ کی جانب سے ہے تو بلا چوں چرا اس کو مان لینا۔ اس معنی میں مسلم کہلانے کا حقدار وہی شخص ہے جو ہر چیز اللہ تعالی کے سپرد کر دے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے۔ کلمہ "پیٹھ" میں تشبیہ کا استعمال کیا گیا ہے، کیوں کہ جب آپ نے قدم کی اضافت اسلام کی طرف کی جو کہ کسی نہ کسی چیز پر ہی ٹھہر سکتا ہے، اس لیے آگے آپ کو

ہو۔ اس پر مستزاد یہ کہ اس معنی کی تعیین میں وہ ظن کی قید شامل کر دیتے ہیں اور اس میں یقینی و حتمی طور پر اس معنی کی حقیقی مراد اللہ تعالی کے علم کے سپرد کر دیتے ہیں، اب اگر آپ غور کریں تو یہ بھی ایک طرح کی "تفویض" ہی ہے، لیکن اس تفویض کو ہم "**تفویض خفی**" سے تعبیر کریں گے۔

خلاصہ یہ کہ نصوص متشابہات کے ساتھ تعامل کرنے کے چار مراحل ہیں:

۱) ان نصوص پر ایمان لانا۔

۲) ان نصوص کا جو ظاہری و لغوی معنی ہے، اس سے اللہ تعالی کی تنزیہ و پاکی بیان کرنا۔

۳) اس کی حقیقی مراد کو اللہ تعالی کے علم کے سپرد کر دینا۔

۴) تنزیہ کرنے کے بعد اس کے معنی مراد کو ظنی طور پر متعین کر دینا۔

پہلے مرحلے میں تمام اہل ایمان متفق ہیں، دوسرے مرحلے میں مشبہہ و مجسمہ اہل سنت سے الگ ہو گئے۔ اہل سنت ظاہری اور لغوی معنی سے اللہ تعالی کی تنزیہ بیان کرتے ہیں اور اہل تشبیہ و تجسیم اسی ظاہری معنی کو اللہ تعالی کے لیے ثابت کرتے ہیں۔ تیسرے مرحلے پر آ کر اہل سنت میں سے اہل تفویض، اہل تاویل سے جدا ہو گئے، "اہل تفویض" ظاہری معنی سے تنزیہ کرنے کے بعد کسی خاص معنیٰ مراد کی تعیین نہیں کرتے اور اس کا علم اللہ تعالی کے سپرد کر دیتے ہیں اور "اہل تاویل" ظاہری معنی سے تنزیہ کرنے کے بعد ظنی طور پر اس کے معنیٰ مراد کی تعیین بھی کر دیتے ہیں۔ لہذا تیسرا مرحلہ اہل تفویض کے لیے ہے اور چوتھا مرحلہ اہل تاویل کے لیے۔

(مستفاد از کلام استاذ محترم و شیخ مکرم شیخ احمد محمود الشریف حنفی ماتریدی)

تسلیم کے لیے پیٹھ کا استعارہ لانا پڑا، تاکہ اسلام کا قدم اس پر ثابت و پائدار رہ سکے، کیوں کہ اسلام کی تعریف ہی یہی ہے: اللہ کے سامنے جھکنا۔ اور اس معنی پر کوئی بھی شخص اس وقت تک عمل نہیں کر سکتا جب تک وہ اللہ تعالی کی طرف سے آئی ہوئی ہر چیز کو تسلیم نہ کرلے اور اس کے احکام پر، ہر طرح کا اعتراض چھوڑ نہ دے۔

جس نے اس علم کو جاننے کی کوشش کی جو علم بشری عقل کی حدوں سے پرے ہے اور اس کی عقل تسلیم وقبول کے آگے ہتھیار ڈالنے پر راضی نہیں ہوئی تو وہ خالص توحید کا نور کبھی بھی نہیں پاسکتا، اسے سچی معرفت کبھی بھی حاصل نہیں ہو سکتی، اور نہ ہی حقیقی ایمان کی دولت اس کو کبھی مل سکتی ہے۔

اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ جس نے بھی اللہ ورسول کی جانب سے ثابت شدہ چیزوں کے آگے سر تسلیم خم کرنے کی بجائے اس علم پر واقف ہونے کی کوشش کی جو مخلوق کی پہنچ سے کوسوں دور، غیب کے پردے میں کہیں چھپا ہوا ہے، تو اس کی یہ کوشش اللہ تعالی کے معاملات میں اپنی مرضی داخل کرنے اور تقاضہ اسلام سے منھ پھیرنے کے مترادف ہو گی، اس لیے وہ اپنی اس فاسد سوچ کی وجہ سے خالص توحید، سچی معرفت اور حقیقی ایمان سے محروم رہ جائے گا۔ اور جس کو یہ معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالی حکمت و کمال اور ربوبیت کا جامع ہے اور خود اس کی اپنی ذات میں کمزوری اور جہالت کے سوا کچھ بھی نہیں، وہ تو محض ایک بندہ عاجز ہے [اپنے اس طاقت وقوت والے مولی کا] تو وہ ہمیشہ خضوع و تسلیم اور راضی بر قضائے الہی کا پیکر بنا رہے گا، پھر وہ اللہ کے فیصلوں میں حکمتیں بھی تلاش کرتا نہیں پھرے گا، بلکہ علم و حکمت علیم و حکیم کے سپرد کر دے گا۔ کیوں کہ کسی غلام کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے آقا کے اسرار کی ٹوہ میں پڑے، بلکہ اس کا فرض یہ ہے کہ اس کے

سامنے سر خمیدہ ہو جائے۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَيَفْعَلُ ٱللَّهُ مَا يَشَآءُ﴾ [ابراہیم:۲۷]
"اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے"۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿إِنَّ ٱللَّهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيدُ﴾
[مائدہ:۱] "بے شک اللہ جو چاہتا ہے فیصلہ کرتا ہے"۔ اس لیے کہ اگر وہ تسلیم و رضا پر خوش نہیں ہو گا، اس کو چھوڑ کر حکمت الٰہی کی حقیقت کی معرفت کی ٹوہ میں پڑا رہے گا اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ اس کی عقل اس کے ادراک سے بھی عاجز ہے، تو ہمیشہ تکذیب و تصدیق کے درمیان تردد کا شکار رہے گا، پھر ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کا یہ تردد بھی اپنی جگہ قائم رہے اور اس کا ایمان بھی اس کے دل میں سلامت رہے!؟ کیوں کہ جہاں تردد ہو وہاں ایمان نہیں اور جہاں صرف اپنی مرضی چلائی ہو وہاں اسلام نہیں۔

اسی لیے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے آگے فرمایا: لہذا وہ کفر و ایمان کے درمیان، تصدیق و تکذیب کے درمیان اور اقرار و انکار کے درمیان "**تذبذب کا شکار رہے گا**"، شیطانی وسوسے اور شبہات **اس کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے**، صحرائے معرفت میں حیران و ششدر "**وہ بھٹکتا پھرے گا**"، جس صحرا میں جاکر روشن عقلوں کے مقدر میں بھی حیرت ہی آئی، جن مسائل میں اس پر سر تسلیم خم کر دینا ضروری تھا ان میں شک کرنے لگے گا اور نتیجہ یہ ہو گا کہ آخر میں "**راہِ صواب سے بھٹک جائے گا**!" اس حالت میں نہ تو اللہ کی جانب سے آئے ہوئے تمام احکام پر "**اس کا ایمان و یقین ہی رہ جائے گا**" کہ ان کو تسلیم کر کے ان کی حقیقت کا علم اللہ کے سپرد کر دے اور نہ ہی یہ کہا جا سکتا کہ "**وہ اس حالت میں منکر اور جھٹلانے والا ہو جائے گا**"، اس لیے کہ کسی چیز کے وجود و عدم میں جب دونوں طرف برابر ہوں یعنی اس میں اسے شک ہو تو اس وقت تک اس احساس کو جھٹلانے کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ اور اللہ تعالی نے قرآن مجید میں یہ خبر بھی دی ہے کہ متشابہات کے پیچھے پڑ جانا کج

قلبی ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ﴾ [آل عمران:۷] "جن کے دلوں میں ٹیڑھا پن ہے وہ قرآن کے متشابہات کے پیچھے لگتے ہیں"۔

حاصل کلام یہ ہے کہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے "صفاتِ متشابہات" میں مذہبِ سلف کو اختیار کیا ہے جو کہ "ترکِ تاویل" کا قائل ہے اور یہی قول محققین کے نزدیک راجح بھی ہے، کیوں کہ کسی لفظ کا جب کوئی راجح اور ظاہری معنی ہو، پھر اس سے زیادہ کوئی قوی دلیل آکر یہ ثابت کر دے کہ یہاں پر یہ ظاہری معنی مراد نہیں ہے تو اس وقت ہمیں یہ یقین ہو جائے گا کہ ہو نہ ہو یہاں پر اس حقیقت کا کوئی مجازی معنی ہی مراد ہو گا اور چوں کہ اس ایک لفظ کے مجازی معنی بہت سے ہو سکتے ہیں پر یہاں پریشانی یہ ہے کہ یہاں پر ان بعض معانی کو دوسرے بعض معانی پر ترجیح دینے کے لیے "غیر قطعی ترجیح کے اسباب" کے سوا ہمارے پاس کوئی دوسری دلیل نہیں ہے، اس لیے یہ دلیل زیادہ سے زیادہ ظن کا فائدہ ہی دے سکتی ہے اور کسی قطعی مسئلہ پر عمل کرنے کے لیے دلیل ظنی کا سہارا لینا جائز نہیں ہے اور تاویل میں یہی سب لازم آتا ہے۔

مثال کے طور پر ارشاد باری تعالی ہے: ﴿الرَّحْمَٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَىٰ﴾ [طٰہٰ:۵] "رحمن نے عرش پر استوا فرمایا جیسا اس کی شان کے لائق تھا"۔ اس کلام میں دلیل قطعی نے اس بات کو ثابت کر دیا کہ یہاں پر "استوی" کا حقیقی معنی مراد نہیں ہے، کیوں کہ اللہ تعالی کا کسی مکان میں ہونا محال ہے، لہذا یہاں پر کسی قطعی دلیل کے ذریعہ اس ظاہری لفظ کی تاویل میں کسی خاص معنی کو مراد لینا ممکن نہیں تھا، اور اللہ تعالی کی ذات و صفات کے

بارے میں صرف دلیل ظنی کا سہارا لے کر کوئی کلام کرنا جائز نہیں، اس لیے یہاں پر تاویل چھوڑ کر اس پر سکوتی موقف کی راہ متعین ہو گئی۔ اور رہی کسی خاص معنی میں اس کی تاویل تو اس کا علم اللہ تعالی کے سپرد کر دیا جائے گا، اس یقین کے ساتھ کہ اس کا ظاہری معنی مراد نہیں ہے! یہی حکم باقی آیات متشابہات کا بھی ہے۔

دار السلام یعنی اہل جنت کے لیے رویت باری تعالی کا جس کسی کو بھی محض وہم رہا یا جس کسی نے بھی اس میں اپنی ذاتی سمجھ سے تاویل کی تو اس کا اس رویت پر ایمان لانے کا کوئی مطلب نہیں ہے۔

دارالسلام سے ان کی مراد جنت ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَٱللَّهُ يَدۡعُوٓاْ إِلَىٰ دَارِ ٱلسَّلَٰمِ﴾ [یونس:۲۵] "اور اللہ دار السلام (یعنی جنت) کی طرف بلاتا ہے"۔ جنت کو دار السلام کہنے کی دو اور وجہیں بھی ہو سکتی ہیں:

پہلی: "السلام" اللہ تعالی کا ایک نام ہے اسی وجہ سے جنت کو اسی کی طرف منسوب کر دیا گیا، کیوں کہ وہ اتنی خوب صورت ہے کہ وہ اسی طرح کی تعظیم کی مستحق تھی۔

دوسری: اس کا نام دار السلام اس وجہ سے بھی ہے کیوں کہ جو بھی اس میں داخل ہو گیا وہ ان تمام آفات و عیوب اور نقائص سے حفاظت و سلامتی میں رہے گا جو اس دنیا کا جز ولا زم ہیں، کیوں کہ وہ اپنے اس نام کی ہو بہو عملی تصویر ہے۔

اس کو اس نام سے موسوم کرنے کے پیچھے ایک وجہ اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ چونکہ جنت میں کثرت کے ساتھ سلام کیا جائے گا اس لیے اس کا نام ہی دار السلام پڑ گیا۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿لَا يَسۡمَعُونَ فِيهَا لَغۡوٗا وَلَا تَأۡثِيمًا ۝٢٥ إِلَّا قِيلٗا سَلَٰمٗا

سَلٰمًا﴾ [واقعہ:۲۶،۲۵] "وہ اس میں سوائے "سلامتی ہو سلامتی ہو" کے سوا کوئی لغو وفحش کلام نہیں سنیں گے۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہاں پر ملائکہ ان کو سلام کریں گے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ﴾ [زمر:۷۳] "تم پر سلامتی نازل ہو اب ہر پلیدگی سے تم پاک ہو چکے ہو"۔

اور جس کو اس رویت باری تعالی کا محض وہم وگمان ہو یقین نہ ہو تو اس کو اس رویت پر ایمان لانا نہیں کہہ سکتے، کیوں کہ وہم ایسی موہوم چیز کا ہوتا ہے جو ایسی جزئی ہو کہ اس کی صورت حواس پر چھپ جاتی ہو، اس لیے کہ وہم ہمیشہ ان جزئیات کا ادراک کرپاتا ہے جو مادی اثرات سے خالی نہ ہوں اور یہ سب چیزیں اللہ تعالی کے حق میں محال ہیں۔ لہذا جو بھی اس معنی میں رویت کا قائل ہے گویا سرے سے ہی اس کے نزدیک رویت کا کوئی معنی نہیں اور نہ ہی اس پر اس کا ایمان ہے۔

اور جس نے بھی اس میں اپنی ذاتی سمجھ اور فہم سے تاویل کی تو اس باب میں اس کے ایمان کا بھی کوئی اعتبار نہیں کیا جائے گا، اس لیے کہ کسی چیز کی فہم و سمجھ اس وقت حاصل ہوتی ہے جب عقلی غور و فکر کے ذریعہ اس چیز کی ماہیت و حقیقت عقل میں آجائے اور یہاں پر ماجرا یہ ہے کہ وہ معنی جس کی نسبت ربوبیت کی طرف کی جارہی ہے اس کی معرفت تک عقل کی رسائی ہی نہیں ہے، کیوں کہ اس موضوع میں عقلیں آج بھی حیران ہیں، الوہیت کے صحراء میں بشری عقل و نظر، ان کی فکر ورائے سب کچھ سرگرداں ہے، اس کی حقیقت کے ادراک کے سبھی گلیاروں اور سبھی راستوں پر آج بھی بند کھڑے ہوئے ہیں کہ فکر و نظر کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرلے وہ اس کی پہنچ سے پرے ہی رہے گا۔ اسی وجہ سے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس وقت تک رویت پر ایمان صحیح نہیں مانا جائے گا

جب تک وہم و فہم کی تاویل کے چکر سے باہر نکل کر، اس رویت کی کیفیت اللہ تعالی کے سپرد نہ کر دے، کیوں کہ ربوبیت اس ماہیت سے پاک ہے جس کا ادراک پردہ عقل پر ظاہر ہوتا ہے اور اس کیفیت و مقدار سے بھی منزہ ہے جس کے شعور کی گتھیاں وہم سے سلجھتی ہیں۔

[رویت باری تعالی پر ایمان رکھنے کا اس وقت تک کوئی مطلب نہیں ہے] جب تک وہ تاویل چھوڑ کر مذہب تسلیم (تفویض) کو نہ اپنالے اور جتنے بھی رسول ہیں سب اسی مذہب پر تھے۔

یہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے مذکورہ قول: لا يصح الإيمان (یعنی ایمان صحیح نہیں ہو گا) سے استثنا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رویت کی کیفیت میں تاویل چھوڑ کر تسلیم کو اپنائے بغیر رویت پر ایمان صحیح نہیں ہو گا۔ اسی لیے معتزلہ نے جب اس کی تاویل میں یہ کہا کہ رویت اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب کسی شے کو دیکھنے والا اس کے بالمقابل کھڑا ہو اور ساتھ ہی ساتھ دونوں کے درمیان نہ تو بہت زیادہ دوری ہو اور نہ ہی بہت زیادہ قرب ہی ہو اور ان دونوں کے درمیان شعاع کا اتصال بھی ہو، انہیں سب چیزوں کو دیکھتے ہوئے انہوں نے کہا کہ آخرت میں دیدار الہی محال ہے۔ اگر یہیں پر وہ تاویل سے باز رہتے اور [رویت کی کیفیت کے پیچھے نہ پڑ کر] اصل رویت پر ایمان لے آتے تو کبھی بھی وہ اس کے منکر نہ ہوتے۔

اور انبیا کا بھی یہی مذہب ہے کہ تاویل کو چھوڑ دیجیے اور تسلیم کا پٹکا اپنے گلے میں ڈال لیجیے۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿قُلْ إِنَّ هُدَى ٱللَّهِ هُوَ ٱلْهُدَىٰ ۖ وَأُمِرْنَا لِنُسْلِمَ

لِرَبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ﴾ [انعام: ۷۱] "آپ فرمادیجیے کہ اللہ کی ہدایت ہی حقیقی معنوں میں ہدایت ہے اور ہمیں یہ حکم ملا ہے کہ جو سارے جہاں کا رب ہے اپنا سب کچھ اسی کے سپرد کردیں"۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی حکایت بیان کرتے ہوئے اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا: ﴿إِذۡ قَالَ لَهُۥ رَبُّهُۥٓ أَسۡلِمۡۖ قَالَ أَسۡلَمۡتُ لِرَبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ﴾ [بقرہ: ۱۳۱] "جب اس کے رب نے اس سے کہا اپنے آپ کو میرے سپرد کرو اس نے عرض کی کہ میں نے اس ذات کے سپرد کیا جو سارے جہان کا رب ہے"۔ لہذا ہم پر یہ واجب ہے کہ ہم ان کی اقتدا کریں، ان کے راستے سے راہ نمائی لیں، جو بھی ان کے راستے سے ذرا سا بھی ہٹا وہ اپنی بے وقوفی کے ہاتھوں حق سے ہٹ گیا، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَمَن يَرۡغَبُ عَن مِّلَّةِ إِبۡرَٰهِـۧمَ إِلَّا مَن سَفِهَ نَفۡسَهُۥ﴾ [بقرہ: ۱۳۰] "اور کون ایسا ہو سکتا ہے جو ابراہیم کے دین سے مائل ہو کر اسے چھوڑ دے، سوائے اس کے جو اپنے نفس کی حقیقت سے ناآشنا ہو!؟" اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کی اتباع کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿ثُمَّ أَوۡحَيۡنَآ إِلَيۡكَ أَنِ ٱتَّبِعۡ مِلَّةَ إِبۡرَٰهِيمَ حَنِيفٗا﴾ [نحل: ۱۲۳] "پھر ہم نے آپ کی طرف وحی کی کہ ابراہیم کے سیدھے دین کی اتباع کیجئے"۔ اور اکثر انبیاے کرام نے اپنی قوموں کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کی اتباع کرنے کی دعوت دی ہے۔

اور جو اپنے آپ کو (رویت باری تعالی کی) نفی کرنے میں اور مخلوق سے اس کو تشبیہ دینے میں پڑنے سے روک نہیں سکا تو اس کا قدم صراطِ مستقیم سے بہک گیا اور تنزیہ کا حق اس سے ادا نہ ہو سکا۔

جو رویت باری تعالی کی نفی کرنے سے باز نہیں آیا جب کہ شریعت میں اس کا ثبوت موجود ہے اور اپنے آپ کو تشبیہ سے روک نہ سکا جو کہ عقل و نقل دونوں کے خلاف ہے، تو وہ حق سے پھسل کر باطل کے گڑھے میں جا گرا اور اس پر مستزاد یہ کہ اس کے مقدر میں وہ تنزیہ بھی نہ آسکی جس کو وہ رویت کی نفی یا پھر تشبیہ کے راستے پر کہیں تلاش کر رہا تھا، جیسا کہ معتزلہ اور اہل تشبیہ کا مذہب ہے۔

حاصل کلام یہ کہ معتزلہ اسی زعم میں رویت باری تعالی کا انکار کر بیٹھے کہ وہ ذات الہی کی اس رویت سے تنزیہ کر سکیں جو رویت مادی اجسام کی خاصیت ہے اور اہل تجسیم اجسام مادی کی رویت کی طرح ذات باری تعالی کے لیے بھی رویت کو ثابت کر بیٹھے، اس کے پیچھے ان کا زعم یہ تھا کہ اگر یہ نہ مانا تو اس صفت رویت کی تعطیل لازم آئے گی، کیوں کہ ان کے نزدیک جس چیز کو حواسہ خمسہ [1] کے ذریعہ نہ جانا جاسکے اس چیز کا وجود بھی نہیں ہو سکتا یعنی اس کو اگر آسان لفظوں میں کہیں تو جو چیز محسوس نہیں ہے وہ موجود بھی نہیں ہے۔ اس لیے انہوں نے اپنے گمان میں رویت باری تعالی کو (مخلوق کی رویت سے) تشبیہ دے کر تعطیل سے اللہ تعالی کی ذات کی تنزیہ اور پاکی بیان کر دی! اسی وجہ سے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں مذہب کی تردید کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: جس نے رویت کی نفی کر کے یا پھر تشبیہ کو ثابت کر کے تنزیہ کرنی چاہی تو صراطِ مستقیم سے اس کے قدم بہک گئے اور وہ تنزیہ بھی اس کے ہاتھ نہ آسکی جس کے لیے اس نے یہ جوکھم سر پر اٹھایا تھا اور آخر میں یہی ہوا:

"نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم"

(۱) حواسہ خمسہ: سمع (سننا)، بصر (دیکھنا)، شَم (سونگھنا)، ذوق (چکھنا)، لمس (چھونا)۔

اپنے مذکورہ قول کی دلیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا:

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا رب جل وعلا، صفات وحدانیت سے موصوف ہے اور یکتائی کی ساری خوبیاں اس میں ہیں۔

اور (لباسِ مجاز) میں اس کا مرئی ہونا یعنی دکھنا صفات کمال میں سے ہے، اس لیے کہ جو چیز عقلاً اس کی رویت کو ممکن بنارہی ہے، وہ ہے، اس کا موجود ہونا اور جو بھی موجود ہو اس کا دیکھا جانا محال نہیں ہے لہذا اگر ہم یہ مان لیں کہ اس کی رویت محال ہے تو لازمی طور پر ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس کا وجود معدوم اور اس کا عدم ثابت ہے، جس سے اللہ تعالی بلند وبالا ہے۔ لہذا معتزلہ چلے تھے تنزیہ کے ارادے سے رویت کی نفی کرنے، خیر تنزیہ تو کیا ملتی، البتہ باطل کے گڑھے میں وہ ضرور جا پڑے اور ہاتھ ان کے کچھ بھی نہیں آیا۔

اسی طرح سے اس کی صفات کا مخلوق کی صفات کے مشابہ نہ ہونا بھی کمال ہے، کیوں کہ وہ واحد و قہار ہے، آسمانوں اور زمین کا خالق ہے، تو پھر اس کی مخلوق کی صفات اس کی صفات کے مشابہ کیسے ہو سکتی ہیں اور اس سلسلے میں معتزلہ نے جو جہت و مکان وغیرہ ثابت کر کے اس کی رویت کو اجسام کی رویت سے تشبیہ دی ہے تو یہ در حقیقت انہوں نے اس کی ذات وصفات میں ایک طرح کا نقص ثابت کیا ہے جس سے اللہ تعالی بلند وبالا ہے لہذا وہ بھی اپنے زعم میں تعطیل سے بچنے کے چکر میں اس کے لیے تشبیہ کو ثابت کرنے جیسی غلطی کر بیٹھے۔

اہل تشبیہ کے مذہب کی تردید میں امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اس قول میں اشارہ

فرمایا ہے:

اس میں مخلوق کے معانی (یعنی صفات) میں سے کوئی بھی معنی (یعنی صفت) نہیں پایا جاتا۔

لہذا اس کی رویت میں مقابلہ و اتصال اور شعاع وغیرہ کسی بھی چیز کا وہم نہیں کیا جاسکتا، جیسا کہ مخلوق کی رویت کے وقت ان سب چیزوں کا تصور ہوتا ہے، بلکہ اہل جنت بلا احاطے اور بلا کیفیت کے اس کا دیدار کریں گے، جس طرح سے بلا کیفیت و احاطہ کے دنیا میں انہوں نے اسے پہچانا تھا، کیوں کہ جو بھی مرکب ہو وہ اپنے (وجود میں) اجزا کا محتاج ہوتا ہے، جو محتاج ہو وہ ممکن ہوتا ہے اور جو بھی ممکن ہو وہ حادث ہوتا ہے لہذا اس طرح سے وہ فرد و قیّوم نہیں رہ جائے گا! یہیں سے یہ ثابت ہو گیا کہ جو اپنی ذات میں واجب و واحد اور تنہا و یکتا ہو وہ نہ تو کسی حیز میں ہو گا اور نہ ہی کسی جہت میں ہو گا اسی لیے آپ نے فرمایا:

اللہ عزوجل حدود وانتہا، ارکان واعضا اور وسائل سے بلند وبالا ہے۔

اس لیے کہ حد اس کی ہوتی ہے جو محدود و محصور ہو اور حد کے غلبے سے مغلوب ہو اور اللہ تعالی تو قہّار ہے، پھر وہ محدود کیسے ہو سکتا ہے!؟ ارکان و اعضا، اجسام کی صفات ہیں اور وسائل، اجسام کے آلات ہیں اور ذاتِ ازل سبحانہ تعالی ان تمام اوصاف سے پاک ومنزہ ہے۔

دوسری تمام مخلوقات کی طرح چھ کی چھ جہات اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں۔

کیوں کہ اللہ تعالی نے اپنی ذات سے ہر شَے کی مماثلت کی نفی کی ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿لَيۡسَ كَمِثۡلِهِۦ شَيۡءٌ﴾ [شوری:۱۱] "اس کی طرح کوئی بھی شی نہیں"۔ اور

اس کے لیے جہت و تحیز (کسی مکان میں ہونے) کو ثابت کرنا اس کے لیے اجسام سے مماثلت کو ثابت کرنے کے مترادف ہے اور اس کو جہات سے موصوف کرنے کا صاف مطلب یہ ہے کہ جہات نے اس کی ذات کا احاطہ کر رکھا ہے اور اس کے لیے کسی مکان کو ثابت کرنا اس بات کا اعتراف ہے کہ وہ مکان کا محتاج ہے اور یہ سب اس کے حدوث کے اثبات اور اس کے قِدم کی نفی کا دوسرا نام ہے۔ پھر یہ کہ جہت و مکان اسی عالم کا ایک جزو ہے اور اللہ تعالیٰ عالم اور اس کے تمام اجزا سے بے نیاز ہے۔ اس کو آپ اس زاویے سے بھی سمجھ سکتے ہیں کہ چھ کی چھ جہات سب حادث ہیں، جو کہ اسی عالم حادث کے اوصاف ہیں اور اللہ تعالیٰ قدیم ہے، وہ اس وقت بھی تھا جب ابھی نہ تو کوئی مکان تھا نہ کسی وقت کا کوئی پتا تھا اور نہ ہی کسی زمانے کا کوئی نام و نشان تھا۔ تو جب اللہ تعالیٰ ازل میں کسی جہت میں نہیں تھا، کیوں کہ اس وقت کسی بھی جہت کا وجود ہی نہیں تھا، تو اگر ان کے وجود کے بعد اب وہ کسی جہت میں ہو جائے تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ وہ جس صفت پر تھا، اس صفت پر اب باقی نہیں رہا، بلکہ ایک صفت سے دوسری صفت کی طرف منتقل ہو گیا ہے اور یہ تغیر، یہ انتقال یہ سب حدوث کی علامتیں ہیں، جن سے اللہ تعالیٰ پرے ہے۔ اس باب میں اہلِ تجسیم نے ظاہری نصوص سے استدلال کیا ہے۔

اور اس سلسلے میں سَلَف کا مذہب یہ ہے کہ وہ متشابہات پر ایمان لانے کے بعد اس کی تاویل اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتے تھے ساتھ ہی ساتھ ہر طرح کی تشبیہ سے اس کی پاکی بھی بیان کرتے جاتے تھے، اور ان کی تاویل کے بکھیڑوں میں بھی نہیں پڑتے تھے بلکہ ان کا یہ عقیدہ رہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی جو بھی اس سے مراد ہے وہ سب حق ہے اور امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی راستے کو اختیار فرمایا ہے۔

اور خَلَف کا مذہب یہ ہے کہ ان متشابہات کی تاویل کے ذریعہ اس معنی کو ثابت کریں

گے جو معنی اس کی ذات وصفات کے لائق ہو، بغیر اس اعتقاد کے کہ یقیناً یہی اللہ تعالی کی مراد ہے، کیوں کہ اس سلسلے میں کوئی بھی دلیل ایسی نہیں ہے، جو اس مخصوص مراد کی قطعیت پر دلالت کر سکے اسی وجہ سے علمائے کرام نے فرمایا: اللہ تعالی کے قول: ﴿وَهُوَ ٱلَّذِى فِى ٱلسَّمَآءِ إِلَٰهٌ وَفِى ٱلْأَرْضِ إِلَٰهٌ﴾ [زخرف:۸۴] "اور جو آسمان کا خدا ہے وہی زمین کا بھی خدا ہے"۔ سے مراد آسمان وزمین میں اس کی الوہیت کو ثابت کرنا ہے اس کی ذات کو نہیں، جیسا کہ اہل عرب کا قول ہے: "فلان سلطان في العرب والعجم" یعنی "فلاں عرب و عجم کا بادشاہ ہے"۔ اور اسی طرح اللہ تعالی کے قول: ﴿وَهُوَ ٱلْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِۦ﴾ [انعام:۱۸] "اور وہی اپنے بندوں پر قاہر وغالب ہے"۔ میں فوقیت سے مراد غلبہ ومرتبہ کی فوقیت ہے، اونچائی اور جگہ کی بلندی مراد نہیں ہے، کیوں کہ اس میں کوئی بڑائی نہیں ہے اس لیے کہ محافظ بھی بسا اوقات بادشاہ سے مکان کے اعتبار سے اوپر ہوتا ہے۔

خَلف کی بنسبت سَلَف کا طریقہ ایسی تاویل میں پڑنے سے زیادہ محفوظ ہے جو تاویل حقیقت میں مراد ہی نہ ہو اور سَلَف کی بنسبت خَلف کا طریقہ، معترضین واعدائے دین کا منہ بند کرنے لیے اور ان پر اسلام کی حقانیت کو ثابت کرنے کے لیے احکم اور زیادہ مضبوط ہے۔

اِسرا اور معراج

معراج حق ہے اور یقیناً نبی ﷺ کو رات کے ایک حصے میں (مسجد حرام سے مسجد اقصی تک) لے جایا گیا ہے۔

رہا مسجد حرام سے مسجد اقصی تک کا سفر تو وہ نص قرآنی سے ثابت ہے، ارشاد باری

تعالی ہے: ﴿سُبْحَـٰنَ ٱلَّذِىٓ أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِۦ لَيْلًا مِّنَ ٱلْمَسْجِدِ ٱلْحَرَامِ إِلَى ٱلْمَسْجِدِ ٱلْأَقْصَا ٱلَّذِى بَـٰرَكْنَا حَوْلَهُۥ﴾ [اسراء:۱] پاک ہے وہ ذات جو لے گئی اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصی تک، جس کے اطراف میں ہم نے برکت رکھی ہے"۔ اور اس (سفر اسرا) میں معجزے کا ظہور تھا کیوں کہ نبی ﷺ نے اس سفر میں دو مہینوں کی مسافت لمحہ بھر میں طے کر لی تھی۔

اور آقا ﷺ کو حالت بیداری میں جسم وجسمانیت کے ساتھ پہلے آسمان تک لے جایا گیا، پھر وہاں سے جس بلندی تک اللہ تعالی نے چاہا وہ وہاں تک انہیں لے گیا، جس قدر چاہی اس قدر اس نے ان پر کرم ونوازش کی اور جو اسے وحی کرنی تھی وہ انہیں کی۔

سفر معراج کا یہ حصہ قرآن کی بجائے صرف احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے۔ انہیں میں ایک روایت حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے بھی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ (شب اسرا کے دولہا) نبی ﷺ نے شب اسرا کے بارے میں لوگوں کو خبر دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: ایک شب میں "حطیم" میں یا فرمایا: "حِجر" میں لیٹا ہوا تھا اور مجھ پر غنودگی سی طاری تھی کہ اتنے میں ایک آنے والا آیا اور میرے سینے کو چاک کر کے اس میں سے میرا دل نکال لیا، پھر میرے پاس سونے کا ایک طشت لایا گیا جو ایمان سے بھرا ہوا تھا، اس میں میرے دل کو دھویا گیا اور اس کے بعد واپس اپنی جگہ پر رکھ دیا گیا، پھر ایک چوپایہ لایا گیا جو خچر سے کچھ چھوٹا اور گدھے سے ذرا بڑا تھا، اس کا رنگ سفید تھا، وہ ایک پیر یہاں رکھتا اور دوسرا پیر اپنی نگاہ کی آخری حد پر رکھتا تھا، اس کے بعد مجھے اس پر سوار کر دیا گیا، پھر جبریل مجھے آسمانِ دنیا تک لائے اور اس کا دروازہ کھولنے کے لیے کہا، ادھر سے پوچھا گیا: کون؟ انہوں نے جواب دیا: جبریل! پوچھا گیا: آپ کے ساتھ اور کون ہے؟ انہوں نے جواب دیا:

محمد ﷺ۔ پوچھا گیا: کیا انہیں یہاں آنے کی دعوت دی گئی ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: جی ہاں! اس پر ان کی طرف سے کہا گیا: مرحبا خوش آمدید! پھر جب میں اس کاروائی سے فارغ ہوا تو آدم علیہ السلام سے میرا سامنا ہوا تو جبریل نے مجھ سے عرض کی کہ یہ آپ کے باپ آدم ہیں ان کو سلام کیجئے! تو میں نے ان کو سلام کیا، اس پر انہوں نے سلام کا جواب دیا اور کہا: ابن صالح اور نبی صالح کو خوش آمدید۔۔۔ اسی طرح آخر تک باقی حدیثِ معراج [کتب احادیث میں ملاحظہ ہو][(1)]۔

اور بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ معراج کا ثبوت قرآن کریم میں اللہ تعالی کے اس قول سے بھی ملتا ہے: ﴿ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّىٰ ۝٨ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ﴾ [نجم:۸،۹] پھر وہ قریب ہوا پھر اور قریب ہوا حتی کہ ان دونوں کے درمیان صرف اتنی دوری رہ گئی جتنی قوسین (کمان) کے دونوں کناروں کے درمیان ہوتی ہے یا اس سے بھی قریب"۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ اس آیت میں جبریل علیہ السلام کے ساتھ قریب ہونے کی بات کی گئی ہے اور اس پر اللہ تعالی کا یہ قول دلالت کر رہا ہے: ﴿وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَىٰ﴾ [نجم:۷] جب کہ وہ افق اعلی میں تھا"۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جبریل علیہ السلام کے سامنے یہ خواہش ظاہر کی کہ ایک بار وہ ان کے سامنے اپنی اصلی صورت میں آئیں، جس صورت پر اللہ تعالی نے انہیں پیدا کیا ہے، تو انہوں نے غارِ حرا میں ان سے اس کا وعدہ کر لیا۔ وعدے کے مطابق جبریل علیہ السلام مشرق کے افق پر نمودار ہوئے اور ان کی ضخامت سے مغرب تک کا افق ڈھک گیا، پھر وہ قریب ہوئے پھر اور قریب ہو گئے اور یہ قرب قلبی

---

(۱) أخرجه البخاري (۳۰۳۵).

ناحیت سے تھا پھر وہ یعنی (جبریل علیہ السلام) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہوئے پھر اور قریب ہوئے حتی کہ ان کے درمیان قوسین کے دو کناروں کی سی دوری رہ گئی یا اس سے بھی کم[1]۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جبریل علیہ السلام کو ان کی اصلی صورت میں دیکھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر خوف طاری ہو گیا پھر اللہ تعالی نے انہیں آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آدمی کی صورت میں بھیجا حتی کہ وہ ان کو وحی سنانے کے لیے ان سے قریب ہو گئے، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿فَأَوۡحَىٰٓ إِلَىٰ عَبۡدِهِۦ مَآ أَوۡحَىٰ﴾ [نجم:۱۰] تو اس نے اپنے بندے کی طرف وحی کی جو اس نے وحی کرنی تھی۔ یعنی اللہ تعالی کو جو بھی وحی کرنی تھی وہ اس نے اپنے بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جبریل علیہ السلام کی زبانی کر دی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حوض اور آپ کا شفاعت فرمانا

اور وہ حوض جو اللہ تعالی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت کی مدد کرنے کے لیے بخشا ہے حق ہے اور وہ شفاعت بھی حق ہے جس کا اس نے آقا صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ لیا ہے، جیسا کہ خبروں میں آیا ہے۔

رہا حوض تو اس کی دلیل یہ ہے کہ ابو ذر رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی، وہ فرماتے ہیں: میں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! حوض کے پیالوں کا کیا قصہ ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میرے پروردگار کی قسم اندھیری صاف راتوں میں آسمان کے اوپر جتنے تارے ہوتے ہیں اس سے کہیں زیادہ اس پر پیالے ہوں گے، وہ جنّتی پیالے ہوں گے ایک بار جو ان سے پی لے گا پھر محشر میں دوبارہ کبھی اسے پیاس محسوس نہیں ہو گی، اس

---

(۱) «تفسير الثعلبي» (الكشف والبيان عن تفسير القرآن) (۲۵/ ۸۲).

حوض میں جنت سے دو پرنالے گرتے ہوں گے، اس کی لمبائی عُمان سے ایلہ [۱] تک کی مسافت جتنی ہوگی، اس کا پانی دودھ سے بھی زیادہ سفید ہوگا اور شہد سے بھی زیادہ میٹھا ہوگا [۲]۔ (بروایت مسلم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کوثر کیا ہے؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا: جنت کی ایک نہر ہے جو مجھے اللہ تعالیٰ نے جنت میں عطا کی ہے دودھ سے زیادہ سفید ہے اور شہد سے زیادہ شیریں [۳]۔ (بروایت ترمذی)

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے جو یہ فرمایا کہ یہ حوض آقا صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت کی مدد کے لیے عطا کیا گیا ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دن سورج ان سے بہت قریب ہوگا، جس کی وجہ سے وہ شدتِ پیاس سے بلک رہے ہوں گے، اسی حال میں وہ سب تڑپتے بلکتے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ بے کس پناہ میں حاضر ہوں گے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم بروز قیامت موقف کی سختیوں میں حاجت کے وقت ان کی مدد فرمائیں گے، (اس وقت وہ ایسی ٹھنڈک محسوس کریں گے) جس طرح سے کسی چٹیل میدان میں کوئی پیاسا کسی ایسے حوض پر پہنچنے کے بعد محسوس کرتا ہے جس کا پانی برف سے زیادہ ٹھنڈا ہو۔

---

(۱) عُمان مغربی ایشیا کی جنوبی سمت میں مشرقی جزیرہ عربیہ کے جنوبی حصے میں یمن اور متحدہ عرب امارات کے درمیان بحر عرب، خلیج عمان اور خلیج عرب کی حدود پر واقع ہے، اس کی راجدھانی "مسقط" ہے۔ اور "ایلہ" یہ مملکت اردن کا ایک صوبہ ہے جو کہ ملک کی جنوبی سمت میں بحر احمر کے ساحل پر واقع ہے، جو کہ آج کل "عقبہ" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ عقبہ اور عمان کی درمیانی مسافت تقریباً تین ہزار ایک سو چودہ کلو میٹر ہے۔

(۲) أخرجه مسلم (۲۳۰۰).

(۳) أخرجه الترمذي (۲٥٤۲).

اور رہا شفاعت کا قصہ تو جیسا کہ بخاری و مسلم نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بروز قیامت لوگ ایک دوسرے کے پاس موج در موج آ جا رہے ہوں گے، اسی حالت میں وہ آدم کے پاس آکر گڑگڑائیں گے کہ اپنی اولاد کی شفاعت کر دیجیے! یہ سن کر وہ کہیں گے: میں یہ نہیں کر سکتا، البتہ ابراہیم کے پاس چلے جاؤ وہ اللہ کے خلیل ہیں۔ پھر وہ ابراہیم کے پاس آئیں گے وہ بھی یہی کہیں گے کہ میں یہ نہیں کر سکتا البتہ موسی کے پاس چلے جاؤ کیوں کہ وہ اللہ کے کلیم ہیں۔ پھر وہ موسی کے پاس آئیں گے وہ بھی یہی کہیں گے کہ میں یہ نہیں کر سکتا البتہ تم لوگ عیسی کے پاس چلے جاؤ کیوں کہ وہ روح اللہ اور کلمۃ اللہ ہیں۔ پھر وہ عیسی کے پاس آئیں گے ان کے پاس سے بھی انہیں یہی جواب ملے گا کہ میں یہ نہیں کر سکتا البتہ تم لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلے جاؤ۔ پھر وہ سب میرے پاس آئیں گے تو میں ان کی ڈھارس بندھاؤں گا، ہاں ہاں آج میں ہی اس کے لیے ہوں! پھر میں اپنے رب کے پاس آؤں گا اور اس سے اجازت طلب کروں گا، تو مجھے وہ اجازت دے دے گا، پھر میں اس کی بارگاہ میں کھڑا ہو کر اس کی وہ حمد بیان کروں گا جو آج نہیں کر سکتا اسی وقت اللہ تعالی حمد کے وہ کلمات میرے دل میں ڈالے گا، پھر میں اپنے رب کے حضور اتنا لمبا سجدہ کروں گا کہ وہ مجھ سے فرمائے گا: اے محمد اپنا سر تو اٹھاؤ! عرض کرو، سنی جائے گی، مانگو، دیا جائے گا، شفاعت کرو قبول کی جائے گی! تو میں عرض کروں گا کہ اے میرے رب! میری امت میری امت۔۔۔ وہ فرمائے گا: جاؤ جس کے دل میں گیہوں کے دانے کے برابر بھی ایمان ہو اسے جا کر جہنم سے نکال لو، وہ یہاں تک فرمائے گا: جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہو اسے جا کر جہنم سے نکال لو! پھر میں ایسا ہی کروں گا[1]۔

---

(۱) أخرجه البخاري (۳۱٦۲)، ومسلم (۱۹۳).

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری شفاعت میری امت کے گناہ کبیرہ کرنے والوں کے لیے ہے[1]۔ (بروایت ترمذی)

آدم اور اولادِ آدم سے لیا جانے والا عہد وپیمان

وہ عہد جو آدم اور اولاد آدم سے لیا گیا تھا، حق ہے۔

ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنۢ بَنِىٓ ءَادَمَ مِن ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا۟ بَلَىٰ﴾ [اعراف:۱۷۲] "اور جس وقت تیرے رب نے بنی آدم کو ان کے باپ کی صلبوں سے نکال کر ان کی اولاد سے عہد لیا اور انہیں ان کے اوپر گواہ بنایا کیا میں تمہارا رب نہیں انہوں نے کہا کیوں نہیں"۔ لیکن علما اس عہد وپیان کے ثبوت کے تو قائل ہیں، پر اس کی کیفیت کے بارے میں انہوں نے کوئی کلام نہیں کیا ہے، کیوں کہ یہ متشابہات میں سے ہے اور اس کی حقیقت کو لازم قرار دیا ہے کیوں کہ قرآن میں اس کا ذکر آیا ہے۔

شیخ ابو منصور رحمۃ اللہ علیہ (ماتریدی) نے اس کی تاویل میں بعض اہل تاویل کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جس وقت اللہ تعالی نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو اس وقت فرمایا: ﴿أَلَسْتُ بِرَبِّكُم﴾ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں!؟" اور قیامت تک جو بھی انسان آنے والے تھے ان سب کو ذرات کی شکل میں اس وقت عالم وجود پر ظاہر فرمایا پھر ان سے یہ سوال کیا: ﴿أَلَسْتُ بِرَبِّكُم﴾ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں!؟" پھر آگے جا کر ان اہل تاویل کا اس بارے میں اختلاف ہو گیا۔

---

(۱) أخرجه الترمذي (۲٤۳٥).

جن میں سے کچھ لوگوں نے فرمایا کہ اللہ تعالی نے اس وقت انہیں اس طرح سے بنایا کہ ان پر قلم تکلیف کو چلایا جاسکے (یعنی انہیں مکلف بنایا جاسکے) اس طرح سے کہ ان میں حیات اور عقل دونوں رکھیں۔ یہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔

وہیں پر کچھ لوگوں نے فرمایا کہ یہ پیش کش روحوں پر تھی جسموں پر نہیں تھی۔

اور کچھ لوگوں نے فرمایا کہ ان کو دو الگ الگ صفوں میں کھڑا کیا پھر فرمایا: یہ جنتیوں کی صف ہے جن سے مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اور یہ جہنمیوں کی صف ہے اور ان سے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچنے والا! پھر ان پر یہ عہد پیش کیا: ﴿أَلَسْتُ بِرَبِّكُم﴾ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں!؟"

اور کچھ لوگوں نے فرمایا کہ سب پر توحید کو پیش کیا پھر فرمایا: ﴿أَلَسْتُ بِرَبِّكُم﴾ "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟" اور دنیا میں فقر و غنا اور موت وغیرہ جو بھی احوال ان کو پیش آنے والے تھے ان سب سے ان کو آگاہ کیا۔

قضاو قدر

اللہ تعالی کو ازل سے ہی جنتیوں اور جہنمیوں کی تعداد کا ایک بارگی علم ہے، لہذا اس تعداد میں نہ تو زیادتی ہو سکتی ہے اور نہ ہی کوئی کمی اور اسی طرح اسے ان کے ان افعال کا بھی ازل سے ہی علم ہے جو وہ کرنے والے تھے۔

اس کلام کو ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالی کی وسعت علمی پھر اس علم کی ازلیت اور اس کے ساتھ قضاو قدر کو بھی ثابت کر سکیں، تاکہ قضاو قدر میں اگر کسی کو ذرا بھی شک ہو تو وہ دور ہو جائے اور "قدریہ" کے اوہام کا قلع بھی قمع ہو جائے کیوں کہ ان کو

یہ شبہ ہے کہ اللہ تعالی بھلا اس چیز پر عذاب کیسے دے سکتا ہے جس کو خود اسی نے تقدیر میں لکھا ہو؟ اسی شبہ کے جواب میں امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالی کو جنتیوں کا علم ہے کہ وہ جنت میں اس لیے جائیں گے کیوں کہ اپنے اختیار سے دنیا میں وہ ایمان لانے والے اور اس کی اطاعت کرنے والے ہیں، لہذا اسے ان کی تعداد کا علم ہے اور جہنمیوں کا بھی اسے علم ہے کہ وہ جہنم میں اس لیے جائیں گے کیوں کہ دنیا میں وہ اپنے اختیار اور اپنی مرضی سے کفر میں مبتلا ہونے والے ہیں اور اس کی نافرمانی کرنے والے ہیں، جبر واضطرار سے مغلوب ہو کر نہیں۔ اور یہ ناممکن ہے کہ جو ان کا خالق ہو اسی کو ان کا علم نہ ہو؟ ﴿أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ﴾ [ملک:۱۴] جس نے پیدا کیا کیا وہی نہیں جانتا!؟"

اور چوں کہ اللہ تعالی نے ہی دونوں گروہوں کے لیے قضا و قدر کو لکھا ہے اور اسی نے ان کا فیصلہ کیا ہے تو لازمی طور پر وہ ان کی تعداد سے بھی آگاہ ہو گا، کیوں کہ علم کے بغیر قضا کا تصور نہیں ہو سکتا جب کہ اس کی شانِ علم تو یہ ہے: ﴿لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَلَا فِي ٱلْأَرْضِ﴾ [سبأ:۳] "زمین و آسمان میں ذرہ برابر بھی کوئی چیز اس کے علم سے پوشیدہ نہیں"۔ تو بھلا بتایئے وہ اہلِ جنت اور اہلِ جہنم کی تعداد کو کیسے نہیں جانے گا اور اسی طرح چوں کہ ان بندوں کے افعال بھی اس کی خلق کا ایک حصہ ہیں اس لیے وہ بھی اس کے علم میں شامل ہوں گے۔

جس کے مقدر میں جو تھا وہ اس کے لیے آسان کر دیا گیا۔

- حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہمیں ہمارے دین کے بارے میں بتایئے۔ ہم

دین (قدر) کو نہ جاننے میں ایسے ہیں جیسے آج ہی ماں کے پیٹ سے نکلے ہوں- جو آج ہم عمل کر رہے ہیں کیا وہ پہلے سے ہی تقدیر میں لکھا جا چکا ہے اور ان پر قلم قضا پہلے سے ہی چل چکا ہے، یا پھر ہم جب کبھی مستقبل میں کسی فعل کو کرنے کا ارادہ کریں گے تو اس کو کر گزریں گے (بغیر تقدیر میں اس کو لکھے ہوئے؟) تو نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: بلکہ پہلے سے ہی تقدیر میں اسے لکھا جا چکا ہے اور قلم قضا اس پر چل چکا ہے! تو انہوں نے عرض کی کہ تو پھر عمل کرنے کا کیا فائدہ !؟ اس پر آقا ﷺ نے ارشاد فرمایا: عمل کرتے رہو کیوں کہ جس کے مقدر میں جو بھی لکھا گیا تھا وہ اس کے لیے آسان کر دیا گیا ہے اور ہر عمل کرنے والا اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہو گا[1]۔ (بروایت بخاری و مسلم)

ایک دوسری حدیث میں آیا ہے: "عمل کرتے رہو، اللہ تعالی کے قریب ہونے کی کوشش کرتے رہو، ہمیشہ اعتدال پر رہو اور کوشش کرو کہ استقامت کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔

اور اعمال کی قبولیت کا انحصار خاتمے پر ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک آدمی ایک عرصے تک جنتیوں کا سا عمل کرتا رہتا ہے پھر آخر میں خاتمہ اس کا جہنمیوں کے اعمال پر ہوتا ہے اور وہیں پر دوسرا آدمی جہنمیوں کا سا عمل کرتا رہتا ہے پھر اخیر میں اس کا خاتمہ جنتیوں کے اعمال پر ہوتا ہے[2]۔

---

(۱) أخرجه البخاري (٤٦٦٦)، ومسلم (٢٦٤٧).

(۲) أخرجه مسلم (٢٦٥١).

ایک روایت یہ بھی وارد ہوئی ہے: ایک آدمی جہنمیوں کا سا عمل کرتا ہے پھر وہ جہنم میں جا پڑتا ہے، جب کہ وہیں پر دوسرا آدمی جہنمیوں کا سا عمل کرتا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ اس کے درمیان اور جہنم کے درمیان صرف ایک بالشت یا پھر صرف ایک گز کا فاصلہ رہ جاتا ہے، اس کے بعد سعادت اس کو آ پہنچتی ہے (یعنی رب کی طرف سے اسے توفیق مل جاتی ہے) پھر وہ جنتیوں والے عمل کرنے لگ جاتا ہے حتی کہ جنت میں جا پہنچتا ہے[1]۔

اور سعید وہ ہے جس کو اللہ کی قضا سے سعادت ملی اور شقی (بدبخت) وہ ہے جس کو اللہ تعالی کی قضا سے شقاوت (بد بختی) ملی۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث بیان کی جو خود سچے ہیں اور ان کے رب نے ان کی سچائی بھی بیان فرمائی ہے: تم میں سے ہر ایک شخص کا وجود پہلے اپنی ماں کے پیٹ میں چالیس دن تک نطفے کی شکل میں جمع کیا جاتا ہے، پھر اتنی ہی مدت تک وہ خون کی چھینٹ کی شکل میں وہاں رکھا جاتا ہے اور اتنی ہی مدت تک ایک نامکمل بوٹی کی شکل میں وہاں پر رکھا جاتا ہے، پھر اللہ تعالی اس کے لیے چار کلمات کے ساتھ ایک فرشتہ بھیجتا ہے کہ وہ اس کا رزق، اس کی موت کا وقت، اس کا عمل اور اس کی بد بختی یا پھر نیک بختی کو لکھ دے، پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے[2]۔ بروایت بخاری ومسلم۔

---

(1) أخرجه البخاري (٣٠٣٦).

(2) أخرجه البخاري (٣٢٠٨)، ومسلم (٢٦٤٣).

اور قدر کی حقیقت یہ ہے کہ وہ مخلوق کے بارے میں اللہ تعالی کا ایک راز ہے جس کی اطلاع نہ تو کسی مقرّب فرشتے کو ہے اور نہ ہی کسی نبی کو ہے جس کو خود (اللہ تعالی نے) بھیجا ہے۔ جو اس کی ٹوہ میں پڑے گا ذلت ورسوائی اس کا مقدر بنے گی، محرومی اس کے ہاتھ آئے گی اور سرکشوں میں اس کا نام درج ہو جائے گا۔

قدر کی تعریف: اس عالم میں جو کچھ بھی خیر وشر اور نفع وضرر جس بھی صورت میں وقوع پذیر ہونے والا تھا اس کو اسی کے مطابق کر دینا اور کسی بھی زمان کسی بھی مکان میں قضا کے مطابق جو کچھ بھی وقوع پذیر ہونے والا تھا اس کو بیان کر دینا۔

اور یہی اس حکمت وعنایت کی تاویل کی گئی ہے جو ازل میں ہو چکی ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ﴾ [قمر:۴۹] ہم نے ہر چیز تقدیر کے مطابق پیدا کی"۔ اس لیے بشری عقلیں اللہ تعالی کی حقیقت کو نہیں جان سکتیں اور نظریں رب قدیر کے اسرار تک نہیں پہنچ سکتیں اور قدر بھی انہیں غیبیات میں سے ہے جس کے علم کو اللہ تعالی نے اپنے لیے خاص کر لیا ہے اور اس کو اپنی مخلوق کی عقل وفہم سے دور پردہ راز میں رکھا ہوا ہے، اس کو نہ تو اپنے کسی مقرب فرشتے پر ظاہر کیا اور نہ ہی اپنے کسی بھیجے ہوئے نبی پر۔

اسی لیے اس کی ٹوہ میں پڑنے سے خواری کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا، کیوں کہ ایسی کسی حکمت سے نقاب کشائی کے پیچھے اپنے آپ کو ہلاک کرنا جس کا علم اللہ تعالی نے اپنی مخلوق سے پوشیدہ رکھا ہے، شک وانکار کے سبب ہی ہو سکتا ہے اور یہ دونوں ہی چیزیں نفاق کی علامتیں ہیں۔ اسی طرح سے اس کی ٹوہ میں پڑنا باعث ذلت وخواری ہے اس لیے کہ ذلیل ورسوا شخص کی پہچان یہ ہے کہ وہ ناحق اختلاف کے سبب، نصرت وحق یابی سے محروم

کر دیا جاتا ہے، پھر جن چیزوں میں نظر دوڑانے سے منع کیا گیا تھا اس میں مسلسل نظر دوڑانے کی وجہ سے اس کی نظر اس کے لیے ثابت قدمی سے محرومی کا سبب بن جاتا ہے پھر اگر وہ اس حد پر آکر رکتا نہیں بلکہ اسی فعل کو وہ بار بار دہراتا رہتا ہے تو یہی سبب اسے مقام سرکشی پر لے جاکر کھڑا کرتا ہے اور سرکشی کا معنی ہے: بندے کا شریعتِ الٰہی کی حدوں کو پھلانگ جانا۔ کیوں کہ کسی بھی غلام کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ اپنے آقا کے احکام سے اختلاف کرے اور نہ ہی اسے کوئی حق پہنچتا ہے کہ وہ اس کے اسرار ورموز کی ٹوہ میں پڑ جائے اسی لیے انہوں نے یہ کلمات اس نسق پر ترتیب دیے۔

اس (کی ٹوہ میں پڑنے) سے ہر طرح سے بچو۔۔۔ نظر وفکر اور وسوسہ ہر طرح سے۔

بندوں سے جس چیز کا علم مخفی رکھا گیا ہے اس کلام کے ذریعہ اس سے مبالغہ کی حد تک بچنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔

کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے تقدیر کا علم مخلوق سے چھپا کر رکھا ہے اور انہیں اس کی طلب سے باز رہنے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لَا يُسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْأَلُونَ﴾ [انبیاء:۲۳] اس کے افعال کے بارے میں کوئی اس سے پوچھ گچھ نہیں کر سکتا اور ان سے پوچھ گچھ کیا جائے گا"۔ لہٰذا جس نے یہ سوال کیا کہ اس نے یہ کیوں کیا تو اس نے قرآن کے کلام کو رد کر دیا اور جو بھی قرآن کے حکم کو رد کرنے کا مرتکب ہوا تو اس کا شمار کافروں کے زمرے میں ہونے لگے گا۔

اور انہیں قدر کے سلسلے میں غور وخوض کرنے سے اس لیے روکا گیا ہے کیوں کہ اس کی معرفت کی کوئی صورت ہی نہیں ہے۔

ان سب کی ضرورت اللہ تعالیٰ کے ان ولیوں کو پڑتی ہے جن کا دل نور ایمان سے

پر نور ہوتا ہے۔

یعنی ان سب چیزوں کا علم اور ان پر واقفیت اسے ہوتی ہے اور ان کے مقتضا پر عمل بھی وہی شخص کرتا ہے جس کے دل کو اللہ تعالی نے نورِ یقین سے منور کر دیا ہو اور انہیں اپنا ولی بنالیا ہو۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿أَفَمَن شَرَحَ ٱللَّهُ صَدۡرَهُۥ لِلۡإِسۡلَٰمِ فَهُوَ عَلَىٰ نُورٖ مِّن رَّبِّهِۦ﴾ [زمر: ۲۲] جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا تو وہ اپنے رب کی طرف سے نور پر جلوہ فرما ہوتا ہے۔

پھر اس کی توجیہ اپنے اس قول کے ذریعہ پیش کی:

اور یہ راسخین فی العلم کا درجہ ہے کیوں کہ علم دو طرح کا ہوتا ہے ایک وہ علم جو مخلوق میں موجود ہے اور دوسرا وہ علم جو مخلوق سے مفقود ہے لہذا جس طرح سے علم موجود کا انکار کفر ہے بالکل اسی طرح علم مفقود کا دعوی بھی کفر ہے، اور ایمان اس وقت تک ثابت نہیں ہو سکتا جب تک علم موجود کو قبول نہ کر لیا جائے اور علم مفقود کی طلب کو چھوڑ نہ دیا جائے۔

وہ علم جو عالم اور مخلوق میں موجود ہے یہ وہ علم ہے جو ظاہری دلائل اور محیرّ العقول براہین کے ذریعہ معلوم ہو جیسے کہ خالق کی جانب سے نصب کردہ دلائل کے ذریعہ اس کے وجود کا، اس کے قدیم ہونے کا، اس کے کمال کے علم اور کمال کی قدرت اور کمال کی حکمت کا، نقص کے تمام شائبوں اور حدث کی سبھی نشانیوں سے اس کی تنزیہ کا اور تمام صفات جلال و اکرام کا علم اور ان تمام اوامر و نواہی کا بالکل اسی طرح علم جس طرح نبی ﷺ ان کو اُس شریعت مطہرہ کی طرف سے لے کر آئے، جو قرآن سے ثابت ہے، جس کے ہر ہر فن ہر ہر کمال میں آج بھی لوگوں کی عقلیں حیران ہیں اور اسی طرح سے حلال و حرام کے بیان کا علم، یہ سارا کا سارا علم مخلوق میں ہی موجود ہے لہذا اس کا انکار کفر

ہو گا۔

اور رہا وہ علم جو مخلوق سے مفقود ہے جیسے وہ علم جسے اللہ نے اپنی مخلوق سے چھپا کر رکھا ہے مثلاً علم غیب جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے ساتھ خاص کر رکھا ہے اور جیسے علم قضا و قدر اور علم قیامِ قیامت، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿قُل لَّا يَعْلَمُ مَن فِي السَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ ٱلْغَيْبَ إِلَّا ٱللَّهُ﴾ [نمل:٦٥] "آپ فرما دیجیے ایک اللہ کے سوا آسمان و زمین میں جو بھی ہے کسی کو بھی علم غیب کی خبر نہیں"۔ ایک اور جگہ فرمایا: ﴿لَا يُجَلِّيهَا لِوَقْتِهَآ إِلَّا هُوَ﴾ [اعراف:۱۸۷] "وہی اسے اس کے وقت پر ظاہر کرے گا۔ لہٰذا اس علم کا دعویٰ کرنا اور اس کا طلب کرنا بھی کفر ہے کیوں کہ یہ در حقیقت اس چیز میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرکت کا دعوا ہو گا جس کو اس نے اپنے لیے خاص کر رکھا ہے۔

لوح و قلم پر ایمان

لوح و قلم اور جو کچھ بھی اس میں لکھا گیا ہے اس پر ہمارا ایمان ہے۔ اللہ نے اس میں جس کے ہونے کو لکھ دیا ہے اگر پوری مخلوق مل کر بھی اس کو نہ ہونے میں بدلنا چاہے تو بدل نہیں سکے گی اور جس کے نہ ہونے کو اس نے اس میں لکھ دیا ہے اگر پوری مخلوق مل کر بھی اس کو ہونے میں بدلنا چاہے تو بدل نہیں سکے گی۔ قیامت تک جو بھی ہونے والا تھا اس کو لکھ کر قلم اٹھا لیا گیا، بندے کے نصیب میں جو اس نے خطا لکھ دی ہے کوئی بھی اسے دُرستی میں نہیں بدل سکتا اور اس کے حق میں جو دُرستی لکھ دی ہے کوئی بھی اسے خطا میں نہیں بدل سکتا۔

لوح کا ثبوت اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ملتا ہے: ﴿بَلْ هُوَ قُرْءَانٌ مَّجِيدٌ ۝٢١ فِي

لَوۡحٍ مَّحۡفُوظٍ﴾ [بروج:۲۱،۲۲] بلکہ وہ قرآن مجید ہے جو لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے"۔ اور قلم کا ثبوت اللہ تعالی کے اس قول میں ملتا ہے: ﴿نٓۚ وَٱلۡقَلَمِ وَمَا يَسۡطُرُونَ﴾ [قلم:۱] "ن! قلم اور جو کچھ وہ لکھتے ہیں اس کی قسم"۔ لہذا دونوں پر ہی ایمان رکھنا واجب ہے۔

اب رہ گئی یہ بات کہ جو کچھ لوح میں لکھا ہوا ہے اس پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے تو اس کے لیے یہ دلائل ملاحظہ کیجیے: ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَكُلَّ شَيۡءٍ أَحۡصَيۡنَٰهُ فِيٓ إِمَامٖ مُّبِينٖ﴾ [یس: ۱۲] "ہم نے ہر چیز کو امام مبین (لوح محفوظ) میں شمار کر رکھا ہے"۔ امام مبین کی تفسیر میں ایک قول یہ ملتا ہے کہ اس سے مراد لوح محفوظ ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَكُلُّ صَغِيرٖ وَكَبِيرٖ مُّسۡتَطَرٌ﴾ [قمر:۵۳] "اور ہر چھوٹا بڑا لکھا ہوا ہے"۔

اس سلسلے میں عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے، انہوں نے اپنی موت کے وقت اپنے بیٹے سے ارشاد فرمایا کہ اے میرے پیارے بیٹے! اس وقت تک تمہیں ایمان کی چاشنی نہیں مل سکتی جب تک تمہیں یہ یقین نہ ہو جائے کہ اللہ نے جو تمہارے حق میں درستی لکھ دی ہے کوئی بھی اسے خطا میں نہیں بدل سکتا اور تمہارے حق میں جو خطا لکھ دی ہے اسی طرح اسے بھی کوئی درستی میں نہیں بدل سکتا۔ کیوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: سب سے پہلی جو چیز اللہ نے پیدا کی وہ قلم تھا پھر اس سے اس نے فرمایا: لکھ! اس نے عرض کی: اے میرے رب کیا لکھوں؟ اللہ نے

فرمایا: قیامت تک آنے والی ہر شے کی تقدیر لکھ![1] (بتخریج ابو داؤد و ترمذی)

عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس دو کتابیں لے کر آئے اور فرمایا: کیا تم لوگوں کو پتا ہے کہ یہ کیسی کتابیں ہیں؟ ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! آپ ہی بتا دیں۔ تو جو ان کے داہنے ہاتھ میں کتاب تھی اس کے بارے میں آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ وہ کتاب ہے جو سارے جہان کے پالنہار کی جانب سے آئی ہے اس میں سبھی جنتیوں کے، ان کے آباو اجداد کے اور ان کے قبیلوں کے نام ہیں اور اخیر میں ان کی کل تعداد اجمالا مرقوم ہے، لہذا اب اس میں نہ تو کبھی کوئی زیادتی ہو سکتی ہے اور نہ ہی کوئی کمی اور پھر بائیں ہاتھ والی کتاب کے بارے میں ارشاد فرمایا: یہ کتاب سارے جہان کے پالنہار کی جانب سے آئی ہے اس میں سبھی جہنمیوں کے، ان کے آباو اجداد کے اور ان کے قبیلوں کے نام ہیں، پھر اخیر میں ان کی مجموعی تعداد اجمالا مرقوم ہے، لہذا اب نہ تو کبھی اس میں کوئی زیادتی ہو سکتی ہے، اور نہ ہی کوئی کمی۔ اس پر صحابہ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! جب سب کچھ پہلے سے ہی طے ہے تو پھر عمل کا کیا فائدہ!؟ آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہمیشہ صراط مستقیم پر چلنے کی کوشش کرو اور غلو سے بچتے رہو کیوں کہ ایک جنتی کا خاتمہ جنتیوں کے عمل پر ہی ہو گا، اس سے پہلے چاہے وہ جو بھی عمل کرتا رہا ہو، پھر اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا اور اس وقت آپ کے ہاتھ میں جو کچھ بھی تھا اس کو الگ رکھ دیا پھر ارشاد فرمایا: تمہارے رب نے اپنے بندوں کے آخری ٹھکانے کو ان کے دنیوی اعمال کے مطابق لکھ دیا ہے ایک فریق جنت میں جائے گا اور دوسرا فریق

---

(۱) أخرجه أبو داود (٤٧٠٠)، والترمذي (٢١٥٤).

جہنم میں [1]۔

متن میں مذکور باقی الفاظ نبی ﷺ کی اس حدیث میں بیان ہو ہی چکے ہیں کچھ صراحت کے ساتھ لفظوں میں اور کچھ کا صرف مفہوم، لہذا ان کی شرح کی کوئی اتنی خاص ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

بندے کے لیے یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ اللہ تعالی اپنی ہر آنے والی مخلوق کو پہلے سے ہی جانتا تھا بس اس نے اپنی مشیت سے ان کے لیے ایک "تقدیرِ محکم" بنائی جو اٹل ہے نہ تو اسے کوئی ٹال سکتا ہے اور نہ ہی آگے پیچھے کر سکتا ہے۔ نہ تو کوئی اسے مٹا سکتا ہے اور نہ ہی بدل سکتا ہے اور اسی طرح نہ ہی کوئی اس کی تحویل کر سکتا ہے۔ ابتدا سے انتہا تک اس کے آسمان و زمین میں جو بھی مخلوق ہو گی اس میں نہ کوئی کمی ہونے والی ہے اور نہ ہی زیادتی۔

یہ اس بات کا کھلا ہوا بیان ہے کہ اس کا علم اور اس کی مشیئت ازلی ہے، اس کی آنے والی جو مخلوق ہے اس کا ہر سیاہ و سفید، تقدیر و قضا کی شکل میں پہلے سے ہی لکھا جا چکا ہے، ہر شے کا حسن و قبح، خیر و شر، طاعت و معصیت، غِنا و فقر؛ ہر کچھ اس کی حکمت عظیم کے تقاضہ کے مطابق تقدیر میں لکھا ہوا ہے۔

ان کے قول: "اس کی تقدیر کو کوئی بھی بدل نہیں سکتا ہے" سے لے کر: "اس کے آسمان و زمین میں" تک اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہی ایک اکیلا ہے جو حکم و تدبیر کا مالک ہے، وہی ایک تنہا ہے جو اپنے امر میں غالب ہے، اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہو

---

(۱) أخرجه الترمذي (٢١٤١).

سکتا، اور ان سب کے دلائل اوپر گزر چکے ہیں۔

اللہ تعالی کی صفت تکوین قدیم ہے

اس کی تکوین (اور ایجاد) کے بغیر کوئی بھی مکوَّن (یعنی کوئی بھی شے) وجود میں نہیں آتی اور تکوین ہمیشہ حَسَن (اچھی) اور خوبصورت ہی ہوتی ہے۔

یہ بات ذہن پر نقش کر لیجیے کہ تکوین، ایجاد، اِحداث، اِختراع؛ سب کے سب مترادف اسماء ہیں جن کا معنی ہے: کسی معدوم چیز کو پردہ عدم سے نکال کر مظہر وجود میں لانا۔ لیکن یہاں پر اس مفہوم کو تعبیر کرنے کے لیے انہوں نے خاص طور پر لفظ تکوین کو اس لیے چنا تاکہ مذہب ماتریدی کے ائمہ سلَف کی اقتدا کا بھرم قائم رہے۔ کیوں کہ ان ائمہ کرام کا یہ ماننا ہے کہ تکوین اور مکوَّن دونوں میں بڑا فرق ہے: تکوین صفت ازلی ہے جو دوسری تمام صفات کی طرح ذات الٰہی کے ساتھ قائم ہے، جس کا مطلب ہے: **دنیا اور اس میں پائے جانے والے ہر جزو کو جب اس کے وجود کا وقت ہو وجود دینا۔** اور اس کے ذات الٰہی کے ساتھ قائم ہونے کی دلیل یہ ہے کہ یہ عالم اللہ کے اِحداث یعنی اِیجاد سے ہی حادث ہے (یعنی عدم کے بعد وجود میں آیا ہے) اور اگر اِحداث و تکوین اللہ تعالی کی صفت نہ ہوتی (اور اس کی ذات کے ساتھ قائم نہ ہوتی) تو وہ اس کے احداث یعنی ایجاد سے حدوث یعنی وجود میں بھی نہ آتا، پھر تو وہ قدیم ہوتا اس لیے کہ اگر حادث ہوتا تو اس کو دوسری تکوین کی ضرورت پڑتی کیوں کہ یہ بات تو تسلیم شدہ ہے کہ تمام حوادث اللہ کی تکوین کے محتاج ہیں پھر یہ سلسلہ یا تو اسی طرح بغیر کسی انتہا کے چلتا رہتا یا پھر کسی تکوین قدیم پر جا کر رک جاتا۔

اور اس صفت کے ازلی ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اگر یہ حادث ہوتی تو اس کا حدوث یا

تو اللہ کی ذات میں ہوتا اس طرح سے اس کی ذات حوادث کا محل بن جاتی جو کہ محال ہے یا پھر اس کا حدوث اس کی ذات کے سوا کسی دوسری ذات میں ہوتا تو اس صورت میں تکوین اسی دوسری ذات کی صفت کہلاتی کیوں کہ کسی شَے کی صفت دوسری شَے کے ساتھ قائم نہیں ہوتی اس لیے کہ اگر دوسری ذات کے ساتھ قائم ہوتی تو یہ دوسری ذات مکوِّن (وجود دینے والی) کہلاتی نہ کہ اللہ تبارک و تعالی کی ذات عالی مکوِّن کہلاتی۔

اور امام اشعری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول کہ - تکوین اور اس کے علاوہ اِحیا (حیات دینا) و اِماتت (موت دینا) جیسی دوسری صفات فعلیہ حادث ہیں۔ قابل قبول نہیں؛ کیوں کہ ان کے نزدیک بھی یہ عالم ایک لفظ "کُن" سے وجود میں آیا ہے، اسی کو ہم لوگ تکوین سے تعبیر کرتے ہیں اور اس بات میں ہمارا اور ان کا کوئی اختلاف نہیں کہ خطاب "کن" کلام ازلی ہے جو کہ ذاتِ الٰہی کے ساتھ قائم ہے۔ لہذا اب تکوین کو حادث ماننا ایک طرح کا ان کے قول میں تضاد ہے۔

اور اشاعرہ حضرات کا یہ کہنا بھی قابلِ قبول نہیں ہے کہ تکوین و مکوَّن (موجودات) دونوں ایک ہی چیز ہیں دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ اس لیے کہ تکوین صفت ازلی ہے جو اللہ تعالی کی ذات کے ساتھ قائم ہے، بر خلاف مکوَّن (موجودات) کے! ان دونوں کے اتحاد کا دعوا ایسا ہی ہو گیا جیسے کوئی یہ کہے کہ مارنا اور جس کو مار پڑ رہی ہے دونوں ایک ہی ہیں، دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

یہاں پر اس بات کا بھی خلاصہ ہو جائے تو بہتر ہے کہ تکوین کے قدیم ہونے سے مکوَّن (موجودات) کا قدیم ہونا لازم نہیں آتا، اس لیے کہ مکوَّن کا وجود، وجود کے وقت تکوین کے تعلق پر موقوف ہوتا ہے، لہذا بنفسہ صفت تکوین قدیم ہو گی اور اس کا تعلق

حادث ہو گا، جس طرح سے دوسرے خطابات ازلیہ کا حال ہے۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ تکوین صفت ہے جو اللہ کی ذات کے ساتھ قائم ہے تو اسی کے ضمن میں یہ بھی ثابت ہو گیا کہ وہ بس حَسَن (اچھی) وخوبصورت ہی ہو گی۔

تو یہ سب ایمان کے عقائد اور معرفت کے اصول ہیں اور اس کی وحدانیت وربوبیت کے اعتراف کی جڑ ہیں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا﴾ [فرقان:۲] "اور اس نے ہر چیز پیدا کی پھر اس کی ایک تقدیر لکھی"۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَكَانَ أَمْرُ اللهِ قَدَرًا مَقْدُورًا﴾ [احزاب:۳۸] "اللہ کا فعل ایک پختہ تقدیر میں لکھا جا چکا ہے"۔

یعنی اس سے پہلے قضا وقدر وغیرہ کے سلسلے میں جو بھی عقائد گزرے وہ سب ایمان کا ایک اٹوٹ حصہ ہیں اس لیے کہ جس نے اس بات کا اعتراف نہیں کیا کہ حکمتِ عظیم کے تقاضے کے مطابق پہلے سے ہی قضا وقدر انجام پا چکے ہیں تو اسے اللہ تعالی کے علم ازلی اور اس کی عنایت میں شک ہے، اس کی وجہ سے اس کے عقیدۂ الوہیت میں ایک درار پڑ جائے گی۔

اور غیر اللہ کے لیے تخلیق کو ثابت کرنا خالق کی توحید فی الافعال کو ختم کرنے کے مترادف ہے اور کسی دوسرے کو موجودات کے وجود دینے میں اس کا شریک ٹھہرانے کے برابر ہے اور بلاشبہ اس کے بعد عقیدہ ایمان کی عمارت ڈھے جائے گی، اس لیے ہم ذلت و رسوائی سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

جو قدر کے معاملے میں اللہ کے مقابل آیا، جو دل میں حقد وکینہ بھر کر اس کی ٹوہ میں

پڑا، تو ہلاکت و بربادی اس کا مقدر بنی۔ اس نے چھپے ہوئے رازِ الٰہی کو ٹٹولنے کی کوشش کی اور اس میں بہکی باتیں کر کے گناہ کا طوق اپنے ہاتھوں اپنے گلے میں ڈال لیا اور، جو جھوٹا کہلایا وہ الگ!

یہ اس بات کی تاکید اور تصریح ہے کہ قدر کا انکار کرنا بہت بڑی برائی ہے اور ایسا کرنے والے کو امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے "خصیم "یعنی دشمن خدا کے نام سے یاد کیا ہے، کیوں کہ دلائل قطعیہ کے ذریعہ اس کو ثابت کیا جا چکا ہے۔ لہذا اب جو اس کا انکار کرے گا تو یقیناً اس کا یہ عمل اللہ تعالی کی طرف سے ثابت شدہ چیز میں نزاع کرنے کے مترادف ہو گا اس طرح سے وہ دشمنِ خدا ہو جائے گا پھر اب وہ ہلاکت و بربادی کا بھی مستحق ہو گا۔

اور اس کو "سقیم القلب "یعنی دل میں حقد و کینا رکھنے والا، کہنے کی وجہ یہ ہے کہ جس چیز کا ثبوت دلائل قطعیہ کے ذریعہ ہو چکا ہے اپنے قلبی مرض کی وجہ سے اس میں وہ شک کر بیٹھا، یہیں پر بس نہیں کیا بلکہ جس چیز کو اللہ تعالی نے اپنی مخلوق سے چھپا کر رکھا تھا وہ اس کو جاننے کی ٹوہ میں بھی پڑ گیا۔

اور اسے "افّاک و اثیم" اس لیے کہا کیوں کہ افّاک کا معنی ہوتا ہے جو بہت زیادہ جھوٹ بولے اور اَثیم کا معنی ہوتا ہے جو بہت زیادہ گناہ کرے اور اس سے یہی تو ہوا ہے کہ جس چیز کو اللہ تعالی نے ادلہ قطعیہ سے ثابت کر دیا تھا اس کا وہ منکر ہو بیٹھا۔

عرش اور کرسی

عرش و کرسی حق ہے اور اللہ تعالی عرش اور اس کے علاوہ ہر چیز سے بے نیاز ہے، اس کا علم ہر شے کو محیط ہے اور اس کو ہر شئے پر فوقیت و برتری حاصل ہے اور اس کی مخلوق اس کا احاطہ کرنے سے عاجز ہے۔

اللہ تعالی نے اپنی کتابِ عزیز میں عرش و کرسی کا ذکر فرمایا ہے، لیکن اس کی ماہیت بیان نہیں فرمائی سوائے اس کے: ﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضَ﴾ [بقرہ:۲۵۵] اس کی کرسی تمام آسمان وزمین سے وسیع ہے"۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿رَبُّ ٱلْعَرْشِ ٱلْعَظِيمِ﴾ [توبہ:۱۲۹] عرش عظیم کا رب ہے"۔ لہذا اس سلسلے میں بعض اہل تاویل کا مذہب یہ ہے کہ کرسی علم سے کنایہ ہے اور ان میں سے کچھ لوگوں نے یہ کہا کہ عرش و کرسی دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ ایک اور مقام پر اللہ تعالی نے عرش کا ذکر فرمایا اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ذکر کیا کہ ملائکہ اس کو اٹھائے ہوئے ہیں، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿ٱلَّذِينَ يَحْمِلُونَ ٱلْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهُۥ﴾ [غافر:۷] وہ جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور وہ جو اس کے اطراف میں ہیں"۔ تو وہ عرش جس کا ذکر حمل (اٹھانے) کے ساتھ آیا ہے اس کے بارے میں ان کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد وہ تخت ہے جس کو فرشتے اٹھائے ہوئے ہیں اور بعض کی رائے یہ ہے کہ وہ عرش جس کا ذکر مطلقا ہوا ہے اس سے مراد مُلک بھی ہو سکتا ہے۔

ہمارے علمائے (ماتریدیہ) کے نزدیک صحیح مذہب یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو قرآن وسنت سے ثابت ہو لیکن اس سے عمل کا کوئی تعلق نہ ہو تو اس کی تاویل میں پڑنا ہم پر واجب نہیں ہے، بلکہ واجب یہ ہے کہ اس کے ثبوت کا عقیدہ رکھیں اور اس کی حقیقت کو اللہ تعالی کے علم کے سپرد کر دیں۔

اور یہ جو امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ وہ عرش وغیرہ سے بے نیاز ہے۔ یہ اس وہم کو دور کرنے کے لیے ہے کہ اسے عرش پر متمکن ہونے یا پھر کسی جہت میں سمانے کی کوئی

حاجت ہے، جیسا کہ "اہل تجسیم" کا ماننا ہے، کیوں کہ عرش اس کے پیدا کرنے سے ہی پیدا ہوا ہے، جب وہ اس کو پیدا کرنے سے پہلے مکان سے بے نیاز تھا تو اگر اس کے بعد وہ اس پر متمکن ہو جاتا تو اس کا محتاج بھی ہو جاتا، جو کہ نقص کی علامت ہے اور اللہ تعالی اس سے بلند و برتر ہے۔

اور فوقیت سے مراد قہر و غلبہ اور منزلت و مرتبے کے اعتبار سے فوقیت ہے، فوقیتِ مکانی مراد نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَهُوَ ٱلْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ﴾ [انعام:۱۸] "اور وہ اپنے بندوں پر غالب ہے"۔ اس لیے کہ غلبہ کے لحاظ سے فوقیت کے سوا کوئی بھی فوقیت ہو، اس میں خوبی نہیں ہے کیوں کہ محافظ بھی بسا اوقات مکان کے اعتبار سے سلطان سے اوپر ہو جاتا ہے۔

ایمان و تصدیق اور تسلیم کے ساتھ ہم یہ بلا توقف کہیں گے کہ ابراہیم علیہ السلام کو اس نے اپنا خلیل بنایا اور موسی علیہ السلام سے حقیقت میں کلام کیا۔

اور یہ سب نص قرآنی سے ثابت ہے۔ اور یہ جو امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: "ایمان و تصدیق اور تسلیم کے ساتھ" اس کا سبب نصاری کا یہ وہم دور کرنا تھا کہ ان لوگوں نے عیسی علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہا اور ان کو ابراہیم علیہ السلام پر قیاس کیا کہ جس طرح سے ابراہیم علیہ السلام کو خلیل اللہ کہہ سکتے ہیں اسی طرح عیسی علیہ السلام کو ابن اللہ بھی کہہ سکتے ہیں، جب کہ ان کا یہ قیاس کرنا سرے سے ہی باطل ہے کیوں کہ جو بیٹا ہوتا ہے وہ اپنے والد کی ہی جنس سے ہوتا ہے اور اللہ تعالی کسی بشر کے ہم جنس ہونے سے پاک ہے۔ اور رہا ابراہیم علیہ السلام کو خلیل کہنا تو اس سے اس کا ہم جنس ہونا لازم نہیں آتا، بلکہ اس سے صرف ان کے اللہ تعالی کے قریب ہونے اور ان کی کرامت و شرافت کا پتا چلتا ہے۔ اس لیے دونوں میں زمین و آسمان

کا فرق ہے۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے مصدر کے ذریعہ تاکید لگا کر فرمایا: "وَكَلَّمَ مُوسَى تَكْلِيمًا" اور اس نے موسی علیہ السلام سے حقیقی کلام کیا" جیسا کہ قرآن میں بھی آیا ہے، اس سے مقصود یہ بتانا تھا کہ اللہ تعالی نے ان سے جو کلام کیا وہ حقیقی کلام تھا جو کہ اس کی صفت ہے، مجازی کلام نہیں تھا جیسا کہ بعض لوگوں کا گمان ہے۔ (۱)

---

(۱) معتزلہ کا یہ کہنا ہے کہ کلام اللہ حادث ہے، کیوں کہ کوئی بھی کلام ہو وہ حروف واصوات کی قبیل سے ہوتا ہے اور جو حروف و اصوات کی قبیل سے ہو وہ حادث ہوتا ہے، اس لیے اللہ کا کلام حادث ہے اور چوں کہ حوادث کا قیام اللہ تعالی کی ذات کے ساتھ ہو نہیں سکتا، اس لیے صفت کلام، اللہ تعالی کی ذات کے ساتھ قائم نہیں ہوگی۔ اسی وجہ سے وہ قرآن کے حادث ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ پھر یہ کہ جو قرآن میں آیا ہے کہ "اللہ نے موسی سے حقیقتا کلام فرمایا" (کنز الایمان) تو یہاں پر یہ کلام حقیقی نہیں تھا بلکہ مجازی تھا، یعنی اللہ تعالی نے وہاں پر موجود درخت کے اندر ایک آواز پیدا کر دی تھی، اور اللہ تعالی اور موسی علیہ السلام کے درمیان مکالمہ اسی آواز کے واسطے سے ہوا۔

اور یہاں پر یہ بات قابلِ غور ہے کہ کلامِ الہی کو لیکر معتزلہ اور اہل سنت کے درمیان یہ اختلاف اس کلام کے بارے میں نہیں ہے جو مصحف میں بشکل حروف سیاہی سے لکھا ہوا ہے یا جس کو ہم اپنی زبان سے آواز کے ساتھ ادا کرتے ہیں، یہ کلام (کاغذ اور سیاہی) کا مجموعہ بالاتفاق حادث ہے، بلکہ یہ اختلاف "کلام نفسی" یعنی اس کلام کے بارے میں ہے جس پر وہ کلام حادث دلالت کر رہا ہے جو مصحف اور دیگر آسمانی کتابوں میں لکھا ہوا ہے، اور جو اللہ تعالی کی ذات کے ساتھ قائم ہے، کیا وہ حادث ہے یا قدیم؟ اہل سنت والجماعت کے نزدیک وہ قدیم ہے اور معتزلہ کے نزدیک حادث ہے۔ معتزلہ کی دلیل آپ نے ملاحظہ کرلی، اہل سنت کی دلیل یہ ہے کہ چوں کہ قرآن مجید میں اللہ تعالی کے لیے صفت کلام ثابت ہے، اگر یہ صفت حادث ہوتی تو اللہ تعالی کے ساتھ حوادث کا قیام لازم آتا اس لیے یہ صفت قدیم ہے اور حروف وآواز کی قبیل سے نہیں ہے۔ اور اس میں کوئی استحالہ نہیں ہے جیسا کہ معتزلہ کا گمان ہے، کیوں کہ کلام جس طرح

لفظی ہوتا ہے، اسی طرح غیر لفظی بھی ہوتا ہے جس کو ہم "کلامِ نفسی" سے تعبیر کرتے ہیں، بلکہ کلام میں یہی اصل ہے اور کلام لفظی تو محض اس کلام نفسی کا ترجمان ہے، اخطل نے فرمایا: "إِنَّ الْكَلَامَ لَفِي الْفُؤَادِ وَإِنَّمَا جُعل اللِّسَانُ على الْفُؤَادِ دَلِيلا"، یعنی: کلام تو دل میں ہوتا ہے، زبان کو تو بس دل کا ترجمان بنایا گیا ہے۔

ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَيَقُولُونَ فِي أَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللهُ بِمَا نَقُولُ﴾ [مجادلہ:۸]

"اور وہ اپنے دل میں کہتے ہیں (کلام کرتے ہیں) ہم جو کہتے ہیں اللہ ہمیں اس پر عذاب کیوں نہیں دیتا!؟"

پھر یہ کہ اس کلام نفسی کو سننا ممکن ہے کہ نہیں: اس بارے میں امام اشعری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ عقلاً کلام نفسی کا سننا ممکن ہے، کیوں کہ وہ موجود ہے اور ہر موجود کا سننا عقلاً ممکن ہے، کیوں کہ صفت سمع کا تعلق تمام موجودات سے ہوتا ہے۔ اشاعرہ میں سے امام ابن فورک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ قاری کی قراءت کے وقت دو چیزیں سنی جاتی ہیں: ایک قاری کی آواز، دوسرا کلام اللہ۔ اور امام ابو منصور ماتریدی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کلام نفسی کا سننا عقلاً ممکن نہیں ہے، کیوں وہ حروف وآواز کی قبیل سے نہیں ہے اور جو حروف وآواز کی قبیل سے نہ ہو اس کا سننا عقلاً ممکن نہیں ہے۔

(خلاصہ کلام از "الاعتماد فی الاعتقاد" امام ابو البرکات النسفی)

لیکن ان ائمہ کرام کے نعلین بردار کی ناقص رائے یہ ہے کہ جس طرح سے اللہ تعالی کا کلام کسی مخلوق کے کلام کی طرح حروف واصوات پر مشتمل نہیں ہے، وہ سب سے جدا، سب سے الگ ہے، ہو سکتا ہے اسی طرح اس کے کلام کو سننا بھی سب سے الگ سب سے جدا ہو، اس کو سننے کے لیے وہ تمام شروط نہ ہوں جو ایک مخلوق کے کلام کو سننے کے لیے ہوتی ہیں، جیسے: اس کلام کا حروف اصوات پر مشتمل ہونا، سامع کا مسموع کے مصدر سے بہت دور نہ ہونا، سماعت کا سلامت ہونا وغیرہ، بلکہ اس کی سماعت بلا کیفیت ہو جس طرح اس کی رویت بلا کیفیت ہو گی۔ کلام نفسی کی اصل سماعت پر یقین رکھیں اور اس کی کیفیت کو اللہ تعالی کے علم کے سپرد کر دیں۔ اس طرح سے یہ ناقص رائے مذہب ماتریدی کے "مسئلہ تفویض" سے قریب تر بھی ہو جائے گی۔

ملائکہ، انبیا اور تمام آسمانی کتابوں پر ایمان رکھنا

تمام فرشتوں پر، سارے نبیوں پر اور سبھی رسولوں پر اتری سبھی کتابوں پر، ہم ایمان رکھتے ہیں اور ہم اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ وہ سب کھلے اور واضح حق پر تھے۔

فرشتوں پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان کے تعلق سے اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ وہ روحانی مخلوق ہیں، جن کے اندر حیات پائی جاتی ہے، وہ اللہ کے حکم سے آسمان پر چڑھتے اترتے ہیں، ان کی لذت کا سامان ذکر الٰہی ہے اور ان کے انس کا سبب اس کی عبادت و معرفت ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿لَا يَعْصُونَ ٱللَّهَ مَآ أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ﴾[تحریم:٦] جو اللہ نے انہیں حکم دیا ہے اس میں وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے"۔

اور نبیوں پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ نے انہیں اپنے پیغام کی تبلیغ کے لیے چن لیا ہے، انہیں اس نے اپنے درمیان اور اپنے بندوں کے درمیان پیغام رسانی کا شرف بخشا ہے۔ رسالت اپنی کوشش سے حاصل نہیں کی جاسکتی بلکہ یہ انعامِ الٰہی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اسے نوازتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿ٱللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُۥ﴾[انعام:١٢٤] اور اللہ بہتر جانتا ہے کہ اس نے اپنا پیغام پہنچانے کے لیے کسے چننا ہے"۔ اور وہ گناہوں سے معصوم (محفوظ) ہیں۔ وہ سب فرشتوں سے افضل ہیں اور ان میں بعض، بعض سے افضل ہیں۔

اب یہاں پر یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ تو پھر امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرشتوں کو انبیا پر ذکر کرنے میں اور ان پر ایمان لانے میں مقدم کیوں رکھا!؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالی

نے فرشتوں کے واسطے سے ہی انبیا پر وحی نازل فرمائی ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿نَزَلَ بِهِ ٱلرُّوحُ ٱلۡأَمِينُ ۝١٩٣ عَلَىٰ قَلۡبِكَ لِتَكُونَ مِنَ ٱلۡمُنذِرِينَ﴾[شعراء:۱۹۳،۱۹۴]اس کو روح الامین نے آپ کے قلب پر اتارا تاکہ آپ ڈر سنائیں"۔ اسی سبب سے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کا ذکر بھی پہلے کیا۔

اور کتابوں پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس بات پر ایمان رکھیں کہ وہ سب اللہ کی جانب سے اس کے رسولوں پر بشکل وحی نازل ہوئیں یا تو بغیر کیفیت کے اسی سے بنفس نفیس سن کر، یا پھر کسی فرشتے کے ذریعہ جس کو یہ پیغام پہنچانے کے لیے ان پر اتارا گیا ہو[1] اور یہ یاد رہے کہ ان کتابوں کی تنظیم کاری میں یا پھر اس کے مفہوم کی ادائیگی میں نہ تو کسی نبی کا کوئی ہاتھ ہے اور نہ ہی کسی فرشتے کا۔

---

(۱)ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيمٌ﴾[شوری:۵۱]"کسی بشر کی یہ شان نہیں کہ اللہ تعالی اس سے کسی طرح کلام کرے مگر یہ کہ وحی کے ذریعہ یا پردے کے پیچھے سے، یا کوئی رسول بھیجے تو وہ اس کے حکم سے جو وہ چاہے وحی کرے بے شک وہ بہت بلند بڑی حکمت والا ہے"۔ یعنی اللہ تعالی کے کسی بندے سے کلام کرنے کے تین طریقے ہیں، یا تو وہ خواب میں اسے کچھ دکھاتا ہے، یا اس کے دل میں کوئی الہام کرتا ہے، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب میں دکھایا کہ وہ اپنے بیٹے اسماعیل کو ذبح کریں اور موسی علیہ السلام کی والدہ کے دل میں یہ بات ڈالی کہ وہ اپنے بیٹے موسی کو ایک تابوت میں رکھ کر نہر نیل میں چھوڑ دیں۔ دوسرا طریقہ ہے کہ بندہ پردے کے پیچھے سے صرف آواز سنے اسے کلام کرنے والا دکھائی نہ دے، جیسا کہ حضرت موسی علیہ السلام کے ساتھ طور پر پیش آیا۔ اور تیسرا طریقہ یہ ہے کہ وہ کسی فرشتے کو اپنے بندے کے پاس بھیجے اور وہ فرشتہ اسے اللہ تعالی کا پیغام سنادے جیسا کہ غارِ حرا میں ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیش آیا۔

اور ہم اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ وہ سب کے سب صاف اور واضح حق پر تھے جس کی تائید میں انہیں ایسے معجزے دیئے گئے تھے کہ ان کے آگے سب عاجز آجاتے تھے اور ایسے دلائل دیے گئے تھے جو سب پر چھا جاتے تھے۔

اہل قبلہ کو مومن کہنے کی شرط

ہم اہل قبلہ کو اس وقت تک مومن کہیں گے جب تک وہ نبی ﷺ کی لائی ہوئی تمام چیزوں کا اعتراف کرتے رہیں گے اور جو کچھ آقا ﷺ نے فرمایا، یا جو بھی آپ ﷺ نے خبر دی وہ اس میں ان کو سچا مانتے رہیں گے۔

جیسا کہ ارشاد نبوی ﷺ ہے: "جس نے ہمارے قبلے کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی اور ہمارا ذبیحہ کھایا تو وہ ہم میں سے ہے"[1]۔ لہٰذا جب تک وہ نبی ﷺ کی لائی ہوئی، شریعت اور ان کے لائے ہوئے دین کا اعتراف کرتے رہیں گے، عقیدہ توحید کو مانتے رہیں گے، شریعت کے دامن کو تھامے رہیں گے، اس وقت تک ہم انہیں مومن ہی کہیں گے اور ان پر مومنین کے سارے احکام جاری ہوں گے، ان کے ظاہر کی رعایت کرتے ہوئے ان پر کوئی حکم لگائیں گے اور ان کے باطن کو اللہ کے سپرد کر دیں گے، کیوں کہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے: میں اس لیے بھیجا گیا ہوں تاکہ ظواہر کو دیکھوں اور سرائر (باطن) کا ذمہ دار تو اللہ تعالی ہے[2]۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ شرط "جب تک وہ نبی ﷺ کی لائی ہوئی چیزوں کا اعتراف

(۱) أخرجه البخاري (۳۹۱).

(۲) المقاصد الحسنة (۱۷۸).

کرتے رہیں گے" اس لیے بڑھائی کیوں کہ صرف قبلہ رخ ہو جانا ہی ایمان پر دلالت کرنے کے لیے کافی نہیں ہے جب تک کہ وہ نبی ﷺ کی لائی ہوئی شریعت کی تصدیق نہ کریں، کیوں کہ بہت سے رافضی غلو میں یہ تک بک گئے کہ اللہ تعالی نے جبریل علیہ السلام کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس وحی دے کر بھیجا تھا لیکن غلطی سے وہ محمد ﷺ کے پاس پہنچ گئے اور بعض نے تو ان کو خدا تک بنا دیا تو اب ان لوگوں کو مومن نہیں کہا جائے گا اگرچہ وہ قبلہ رخ کتنی ہی نمازیں کیوں نہ پڑھ لیں۔

اللہ تعالی کی ذات میں غور وخوض کرنے کا حکم

نہ تو ہم اللہ کی ذات میں غور وخوض کریں گے اور نہ ہی دین میں جدال کریں گے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ کتاب وسنت کی اتباع چھوڑ کر محض اپنی عقل سے اللہ کی ذات وصفات میں کلام نہیں کریں گے کیوں کہ اصل یہ ہے کہ اللہ تعالی کے اسماء وصفات میں توقف سے کام لیا جائے جب تک کوئی صریح نص نہ آجائے اور ہم اس کی ذات کی حقیقت میں غور وخوض نہیں کریں گے کیوں کہ افکار اس میں حیران رہ جاتے ہیں پھر ہو سکتا ہے نوبت انکار تک آپہنچے۔ بلکہ اس کے افعال، یا اور اس کی بے مثال کاریگری میں غور وفکر کریں گے کیوں کہ عقل اللہ تعالی کی کبریائی کی حقیقت کے ادراک سے قاصر وعاجز ہے، کیوں کہ ملائکہ کو جب تمام نفسانی گندگیوں سے پاک ہونے کے باوجود اپنے قصور کا اعتراف کرنے کے سوا دوسرا کوئی چارہ نہ سوجھا، انہیں یہ کہنا ہی پڑا: "جتنا تیری معرفت کا حق تھا اتنا ہم تجھے نہ پہچان سکے" ان تمام نفسانی گندگیوں اور عقلوں پر پڑے ان سبھی پردوں کے ہوتے ہوئے جو خلوص ادراک کی نعمت چھین لیتے ہیں بھلا بشر کی کیا مجال کہ وہ اس کی ذات کی حقیقت کا سراغ لگانے کے پیچھے اپنے آپ کو ہلاک کر لے، اس کی ذات کی

حقیقت کی ٹوہ میں پڑنے سے ہو سکتا ہے بندے کے منہ سے وہ نکل جائے جس سے وہ منزہ اور پاک ہے اسی لیے اسے چھوڑ دینا ہی بہتر ہے۔

"اور نہ ہی ہم دین کے بارے میں جھگڑے اور جدال کا پہلو اپنائیں گے" یعنی ہم اہل حق کو صراط مستقیم سے ہٹانے کے لیے اہل ہوا کے شبہات کو لے کر اہل حق سے جھگڑا و جدال نہیں کریں گے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے:"جو باطل پر ہونے کے باوجود جدال چھوڑ دے گا اللہ تعالی اس کے لیے جنت کے اطراف میں ایک گھر بنائے گا اور جو شخص حق پر رہنے کے باوجود جدال چھوڑدے گا اللہ تعالی اس کے لیے بیچ جنت میں گھر بنائے گا اور جس کے اخلاق اچھے ہوں گے اللہ تعالی اس کے لیے جنت کے اعلی حصہ میں گھر بنائے گا"[۱]۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے اور ہم میں قدر کے سلسلے میں جدال چھڑا ہوا تھا، یہ دیکھ کر نبی ﷺ اتنا ناراض ہوئے کہ آپ کا چہرہ سرخ پڑ گیا پھر اسی حال میں فرمایا: کیا اسی چیز کا تمہیں حکم دیا گیا تھا؟ یا پھر اسی کے ساتھ مجھے تمہارے پاس بھیجا گیا تھا؟ تم سے پہلے لوگ اسی وجہ سے ہلاک ہوگئے کہ وہ اپنے دین کے معاملے میں بڑا جھگڑتے تھے اور اپنے انبیا سے بھی اختلاف کر لیتے تھے، میں تمہیں سختی کے ساتھ حکم دیتا ہوں کہ اس (دین) میں جھگڑا مت پیدا کرو![۲] (بروایت ترمذی و ابو داؤد)۔

---

(۱) أخرجه أبو داود (٤٨٠٠)، والترمذي (١٩٩٣).

(۲) أخرجه الترمذي (٢١٣٣).

قرآن میں جدال کرنے سے پرہیز کرنا

اور نہ ہی ہم قرآن میں جدال کریں گے۔

کہ وہ مخلوق اور حادث ہے یا پھر حروف اور آواز کی قبیل سے ہے، بلکہ ہم اس بات پر ایمان رکھیں گے کہ وہ اللہ کی مراد ہے اور اسی کا کلام ہے۔ اسی طرح نہ ہی آیاتِ متشابہات میں جدال کریں گے اور نہ فتنے کی آگ بھڑکانے کے لیے کج دلوں کی تاویلوں کی طرح ان میں تاویلیں کریں گے اور نہ ہی (تواتر سے) ثابت قراءات کی وجوہات میں جدال کریں گے، بلکہ ان میں سے جو بھی قراءت (تواتر کے ذریعہ) ثابت ہے اس کی تلاوت اپنا معمول بنائیں گے اور اس کی قراءت اپنا وظیفہ گردانیں گے۔

اور ہم اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ وہ رب العالمین کا کلام ہے، جسے روح الامین لے کر آئے۔

یہ ملحدوں کے اس افترا کا رد ہے کہ قرآن نبی ﷺ کی صفاتِ جوہری اور پاک دامنی کے سبب طبیعی الہام کا نتیجہ ہے اور یہ کہ نبی ﷺ پہلے اپنے آپ میں اس کی تصویر کشی کرتے تھے پھر انہیں تصویروں کو الفاظ کی شکل دے کر لوگوں کے سامنے پیش کر دیتے تھے پھر انہیں الفاظ کا نام آخر میں قرآن ہو گیا! اس افترا کے باطل ہونے کی دلیل اللہ تعالی کا یہ ارشاد پاک ہے: ﴿وَإِنَّهُۥ لَتَنزِيلُ رَبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ ﴿١٩٢﴾ نَزَلَ بِهِ ٱلرُّوحُ ٱلْأَمِينُ﴾ [شعراء: ۱۹۲، ۱۹۳] "وہ روح الامین (یعنی جبریل) کے ذریعہ رب العالمین کی جانب سے اتارا گیا ہے"۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَإِن كُنتُمْ فِى رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا۟ بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِۦ﴾ [بقرہ: ۲۳] جو کچھ ہم نے اپنے بندے پر اتارا ہے اگر اس

میں تمہیں شک ہے تو جاؤ لا کر دکھاؤ اس جیسی ایک بھی سورت"۔

پھر اسے انہوں نے (یعنی جبریل علیہ السلام نے) سید المرسلین محمد ﷺ کو سکھا دیا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿عَلَّمَهُۥ شَدِيدُ ٱلْقُوَىٰ﴾ [نجم:۵] "اسے اس شخص نے سکھایا جو بہت زیادہ طاقت والا ہے"۔ اس آیت میں یہ جو اس بات کی صراحت ہے کہ جبریل علیہ السلام نے آقا ﷺ کو قرآن سکھایا، سچ پوچھیے تو اس میں ملحدین کے اس وہم کا رد ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی طبیعت و فطرت کے تقاضے سے مغلوب ہو کر خود سے ہی اس کی تصویر کشی کرتے تھے، یا پھر جبریل علیہ السلام ان کو اس کلام کا مفہوم الہام کرتے، پھر وہ اسی الہام کو اپنے الفاظ کا جامہ پہنا کر قرآن کا نام دے دیتے تھے! اور اس وہم کے باطل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت میں "تعلیم و تلقین" کا لفظ صراحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے اور یہ بات تو وہ بھی خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایک فرشتے کی طرف سے تعلیم اسی وقت متصوَّر ہو سکتی ہے جب کہ وہ اس سے کلام سنیں پھر اسے اپنے قرطاسِ دل پر محفوظ کریں اور پھر مخاطبین تک اس کو پہنچا دیں۔

وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، مخلوق کا کلام کسی بھی چیز میں اس کے برابر نہیں ہو سکتا۔

کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا کلام اس کی صفت ازلی ہے جو اس کے ساتھ قائم ہے، تمام لطافتوں اور خوبیوں کا جامع ہے، تمام انس و جن مل کر بھی اس کی طرح ایک چھوٹی سی سورت نہیں لا سکتے، پھر بھلا کسی کو کلامِ بشر کا جو کہ حدوث و نقص کا پلندہ ہے اس عالی و بے مثل و مثال کلام سے برابری کا دعوا ہو بھی تو کیوں کر!

ہم اس کے مخلوق ہونے کے قائل نہیں۔

یہ دراصل معتزلہ کے اس قول کا رد ہے کہ قرآن مخلوق ہے[۱] اور ان کے اس مذہب کے باطل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اللہ کا کلام اس کی صفت ہے جو کہ اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے، لہذا اگر وہ مخلوق ہوتا تو پھر سب سے بڑی مشکل، معاف کیجیے گا! مشکل نہیں بلکہ اس کو استحالے سے تعبیر کریں تو بہتر ہوگا ہاں تو اس کے مخلوق ہونے کی صورت میں استحالہ یہ لازم آتا کہ ایک حادث شے کا قیام اللہ تعالی کی ذات کے ساتھ ہو جاتا، جس سے وہ منزّہ و برتر ہے اور اس سے پہلے اس کی تحقیق گزر چکی ہے۔

اور نہ ہی جماعت مسلمین کی مخالفت کے قائل ہیں۔

حدیث نبوی ﷺ ہے: "جس نے بھی جماعت کے مذہب سے روگردانی کی تو اس نے اسلام کا پٹکا اپنی گردن سے اتار پھینکا"[۲]۔

اور اجماع تو دلائل شرع میں سے ہی ایک دلیل ہے لہذا اس کی مخالفت کرنا کج قلبی اور گمراہی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے، جب کہ نبی ﷺ نے جماعت کا دامن مضبوطی سے تھامنے پر امت کو ابھارا ہے۔ حدیث نبوی ﷺ ہے: **"تم پر سوادِ اعظم کی پیروی لازم**

---

(۱) اس سے پہلے بھی بیان ہو چکا ہے کہ معتزلہ اور اہل سنت کے درمیان یہ اختلاف اس قرآن کے بارے میں نہیں ہے جو حروف کی شکل میں سیاہی کے ذریعہ کاغذ پر لکھا ہوا ہے، وہ بالاتفاق حادث ہے، بلکہ اختلاف اس قرآن کے بارے میں ہے جو کلام نفسی ہے اور اللہ تعالی کی ذات کے ساتھ قائم اور جس پر یہ کلام حادث دلالت کر رہا ہے۔ اہل سنت کے نزدیک وہ قدیم ہے اور معتزلہ کے نزدیک حادث ہے۔

(۲) أخرجه الترمذي (٢٨٦٣)، وأبو داود (٤٧٥٨).

ہے[1]"۔ یہ بھی فرمایا: "**میری امت گمراہی پر اکٹھا نہیں ہو سکتی**[2]"۔ ارشاد نبی ﷺ ہے: "**جس کو عام مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہے**"[3]۔

اہلِ قبلہ کا حکم

ہم کسی بھی اہلِ قبلہ کی صرف کسی گناہ کی وجہ سے اس وقت تک تکفیر نہیں کریں گے جب تک وہ اس (گناہ) کو حلال نہ سمجھنے لگ جائے۔

حدیث نبوی ﷺ ہے: "**تم اپنے قبلہ والوں کی تکفیر نہ کرو!**"[4]۔

اہل قبلہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو کعبہ رخ ہو کر نماز ادا کرتے ہوں اور ساتھ ہی ساتھ نبی ﷺ کی لائی ہوئی شریعت کی سبھی باتوں کی وہ دل سے تصدیق کرتے ہوں۔ اسی وجہ سے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے پہلے فرمایا تھا: "**ہم اس وقت تک اہل قبلہ کو مسلمان کہیں گے جب تک وہ نبی ﷺ کی لائی ہوئی سبھی چیزوں کا اعتراف کرتے رہیں گے!**" ان کی اس بات میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ غلو کرنے والے رافضی اگرچہ وہ قبلہ رخ کتنی ہی نمازیں کیوں نہ پڑھ لیں پھر بھی ان کے لیے اہل قبلہ کی صف میں کوئی جگہ نہیں ہے۔

یہ بات امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے خوارج[5] کے رد میں کہی ہے کیوں کہ ان کا عقیدہ یہ

---

(۱) أخرجه ابن ماجه (۳۹۵۰).

(۲) أخرجه الطبراني في المعجم الكبير (١٣٦٢٣).

(۳) أخرجه الحاكم (٤٤٦٥).

(۴) أخرجه الطبراني في الأوسط (٢٨٤٤)، والدارقطني (١٧٦٦).

(۵) مختصر میں یہ کہ خارجی شروع میں شیعان علی رضی اللہ عنہ میں سے تھے، پھر جب حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما

ہے کہ اگر کسی مسلمان سے گناہ کبیرہ سرزد ہو جائے تو وہ اہل ایمان کے جھرمٹ سے نکل کر اہل کفر کی بھیڑ میں شامل ہو جاتا ہے اور معتزلہ بھی اسی رد کی زد میں آئیں گے کیوں کہ ان کا بھی کچھ اس سے ملتا جلتا مذہب ہے بس فرق صرف اتنا ہے کہ ان کے نزدیک وہ اہل ایمان کے جھرمٹ سے تو نکل جائے گا لیکن اہل کفر کی بھیڑ میں شامل نہیں ہو گا بلکہ دو منزلوں کے بیچ میں پھنسا رہے گا جس کو علم کلام کی زبان میں "منزلۃٌ بینَ المنزلتین" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔(۱)

کے درمیان اختلاف ہوگیا، اور فیصلہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں آنے ہی والا تھا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ مطالبہ کیا کہ دونوں کے بیچ قرآن کو "حکم" بنایا جائے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے اس مطالبے کو منظور کر لیا، جس کے بعد ان کی جماعت میں ہی ایک گروہ آپ سے بغاوت کر بیٹھا، اس کا ماننا تھا کہ اللہ تعالی کے علاوہ کسی اور کو حکم بنانا شرک ہے اور حضرت علی کے پاس واپس نہ جانے پر مصر رہا، ان کا کہنا تھا کہ جب تک حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کی یہ دو باتیں نہیں مان لیتے کہ پہلے وہ اپنے بارے میں یہ اقرار کریں کہ ان سے خطا اور کفر سرزد ہوا ہے، اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ جو بھی معاہدہ کیا ہے اس کو توڑ دیں، اس وقت تک وہ ان کے پاس واپس لوٹ کر نہیں جائیں گے۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کی ایک نہیں سنی تو وہ ان کے قتل کے درپے ہوئے اور آخر میں وہ اپنے اس ناپاک ارادے میں کامیاب بھی ہو گئے۔ ان کو خوارج اس لیے کہا جاتا ہے کیوں کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج کیا تھا۔

(۱) اسی اختلاف سے ایک دوسرے اختلاف کی فرع نکلی کہ وہ گناہ کبیرہ کا مرتکب جو بغیر توبہ کے اس دنیا سے چلا گیا، کیا وہ جہنم میں ہمیشہ ہمیش رہے گا؟ یا پھر اپنے اعمال کی سزا بھگتنے کے بعد جنت میں جائے گا۔ خوارج کے نزدیک چوں کہ اعمال ایمان کا حصہ ہیں، اور عمل اس نے نہیں کیا جس کی وجہ سے وہ حالت کفر پر مرا، لہذا وہ جہنم میں ہمیشہ ہمیش رہے گا اور اس کے ساتھ وہاں کفار سا معاملہ کیا جائے گا، لیکن معتزلہ کے نزدیک نہ تو وہ اسلام میں باقی رہے گا اور نہ ہی کفر میں داخل ہو گا، اس لیے چوں کہ وہ اسلام میں باقی نہیں رہا اس لیے وہ جہنم میں ہمیشہ ہمیش رہے گا اور کفر میں داخل نہیں ہوا اس لیے اسے کفار سا عذاب بھی نہیں ہو گا، بلکہ اس کے عذاب میں تخفیف ہو گی۔ اور اہل سنت کے نزدیک اعمال ایمان کا حصہ نہیں ہیں اس لیے ترک

ان کے اس عقیدے کے باطل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ایک مومن کی صرف گناہ کرنے کی وجہ سے تکفیر نہیں کی جاسکتی، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ تُوبُوٓا۟ إِلَى ٱللَّهِ﴾[تحریم:۸] اے ایمان والو! اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرلو!"

اس آیت میں گنہ گار مومنوں کو توبہ کا حکم دیا گیا ہے اس لیے کہ توبہ کا معنی ہے: اللہ تعالی کے کسی حکم کی مخالفت کے بعد پھر سے اللہ تعالی کی طرف لوٹ آنا۔ اس جگہ صاف لفظوں میں گنہگار کو مومن کہا گیا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ صرف گناہ کی وجہ سے دائرہ ایمان سے نہیں نکلے گا۔

ایک دوسری جگہ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَإِن طَآئِفَتَانِ مِنَ ٱلْمُؤْمِنِينَ ٱقْتَتَلُوا۟﴾ [حجرات:۹] اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں جھگڑ پڑیں"۔ یہاں پر بھی ان کو مومن ہی کہا گیا ہے باوجود اس کے کہ ان میں سے ایک گروہ بغاوت کے سبب گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو بیٹھا ہے۔ یہ آیت بھی ملاحظہ کرتے چلیے: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ كُتِبَ عَلَيْكُمُ ٱلْقِصَاصُ فِى ٱلْقَتْلَى﴾ [حجرات:۹] اے ایمان والو! تم پر مقتول کے سلسلے میں قصاص فرض ہے"۔[بقرہ:۱۷۸] اس آیت میں بھی جان بوجھ کر قتل کرنے والے کو مومن

اعمال کے سبب وہ اسلام سے نہیں نکلا، اسی لیے وہ ہمیشہ ہمیش جہنم میں نہیں رہے گا، بلکہ اپنے ترک اعمال کے گناہوں کی سزا کاٹ کر پھر جنت میں جائے گا، ورنہ ایمان لانے کا فائدہ کیا ہوگا اگر کافر بھی ہمیشہ ہمیش جہنم میں رہے گا اور مومن بھی ہمیشہ ہمیش جہنم میں رہے گا، پھر عدلِ الہی کہاں رہ جائے گا، جس عدل کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرتے ہوئے معتزلہ خود کو "اہل عدل" کہتے ہیں۔

(مستفاد از استاذ محترم شیخ مکرم ڈاکٹر عرفہ النادی استاذ عقیدہ وفلسفہ، جامعہ ازہر، مصر)

کے نام سے ہی مخاطب کیا گیا ہے جب کہ (جان بوجھ کر قتل کرنے کے سبب) اس سے گناہ کبیرہ کا ارتکاب ہو گیا ہے۔ اس کے آگے ارشاد فرمایا: ﴿فَمَنْ عُفِيَ لَهُۥ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ﴾ [بقرہ:۱۷۸] جس کے لیے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معافی ہوئی"۔ یہاں پر اس قاتل کو اسلامی اُخوت کی بنا پر اخ یعنی بھائی کے نام سے یاد کیا گیا ہے لہذا اگر وہ اس قتل کی وجہ سے کافر ہو جاتا تو اس کو بھائی کہنا بھی درست نہ ہوتا۔

یہ تو تھی نقلی دلیلیں اور اس پر عقلی دلیلیں یہ ہیں کہ در حقیقت ایمان نام ہے دل سے تصدیق کرنے کا اور زبان سے اقرار کرنا تو صرف اسی قلبی تصدیق کی ایک نشانی ہے، اور معصیت کا محل اعضاو جوارح ہیں لہذا دونوں کے بیچ یعنی "تصدیق بالقلب اور معصیت بالجوارح" کے بیچ کوئی تضاد نہیں کیوں کہ یہ تضاد تو تب ہوتا جب دونوں کے محل ایک ہوتے لہذا جب تک تصدیق باقی رہے گی اس وقت تک ایمان بھی باقی رہے گا۔ اور اسی قسم کی دوسری دلیل یہ ہے کہ چونکہ اعمالِ صالحہ (اصلِ) ایمان کا حصہ نہیں ہیں لہذا ان کے زوال سے ایمان کا زوال بھی نہیں ہو گا۔

اور یہ سب تفصیل اس وقت تک کے لیے تھی جب تک اس نے گناہ کبیرہ کے ارتکاب کے دائرے کو پھلانگ کر اس گناہ کو حلال سمجھنے کے دائرے میں قدم نہیں رکھا تھا، لیکن اگر وہ اس دائرے میں قدم رکھ چکا ہے تو بلا شبہ وہ کافروں میں ہی گنا جائے گا، کیوں کہ اس صورت میں جن چیزوں کی حرمت اللہ تعالی کی طرف سے دلائل قطعیہ کے ذریعہ ثابت تھی وہ ان کا ہی منکر ہو بیٹھا۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ فَأُو۟لَـٰٓئِكَ هُمُ ٱلْكَـٰفِرُونَ﴾ [مائدہ:۴۴] "جنہوں نے اللہ کے نازل کیے ہوئے پیغام کا فیصلہ نہ مانا تو وہ کافر ہیں"۔

جن مومنین نے اچھے کام کیے (وعدے کے مطابق) ان کے لیے (آخرت میں ثواب کی) امید کرتے ہیں۔

یہاں پر لفظ "امید" سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ تھی کہ صرف صالح عمل جزا کا موجب نہیں ہے، بلکہ یہ تو اللہ تعالی کے فضل اور اس کی رحمت پر موقوف ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے: **تم میں سے کوئی بھی صرف اپنے عمل کی وجہ سے جنت میں نہیں جائے گا۔** کسی نے پوچھا: یارسول اللہ! آپ بھی نہیں؟ تو آقا ﷺ نے ارشاد فرمایا: **میں بھی نہیں، لیکن اللہ نے مجھے اپنی رحمت کے جلو میں لے لیا ہے**[1]۔ اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عملِ صالح اس وقت ذریعہ ثواب بنے گا جب وہ محض رضائے الہی کے لیے ہو اور اس کے نزدیک مقبول ہو، لیکن یہ چیز ایسی ہے جو (ابھی دنیا میں) ہمارے علم میں نہیں ہے، تو پھر اس کا یقین کیوں کر ہو سکتا ہے؟ اس لیے ہم اللہ تعالی کے فضل کی صرف امید ہی کر سکتے ہیں۔

ان کو ہم جنت کی سند نہیں دے سکتے اور نہ ہی ان کی طرف سے اپنا دھڑکا اٹھا سکتے ہیں۔

یعنی مومنین کی طرف سے اس چیز سے ہم بے فکر نہیں ہو سکتے کہ نہ جانے کس گھڑی کفر و نفاق کی آگ ان کے اعمال کو جلا ڈالے یا پھر نہ جانے کس پل عُجب و رِیا، نام و نمود، ان کے اعمال کو اکارت کر دیں! کیوں کہ وہ اس سے معصوم نہیں ہیں، لہذا جب تک وہ بقیدِ حیات رہیں گے ان کی طرف سے یہ دھڑکا لگا رہے گا، کیوں کہ بہر حال اعتبار تو

(۱) أخرجه البخاري (٥٣٤٩)، ومسلم (٢٨١٦).

خاتمے کا ہی ہو گا اس سلسلے میں عبرت کے لیے بلعم بن باعوراء کا قصہ مشہور ہے۔[1]

ان میں جو گنہگار ہیں ان کے لیے ہم دعائے مغفرت کرتے رہیں گے۔

یعنی جو ایمان والے گنہگار ہیں ان کے لیے اللہ سے مغفرت طلب کرتے رہیں گے، کیوں کہ ہمیں ایک دوسرے کے لیے مغفرت طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿اَسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا﴾ [نوح:۱۰] "اپنے رب سے مغفرت طلب کرو! کیوں کہ وہ بہت زیادہ بخشنے والا ہے"۔ اور ملائکہ و انبیا کو مومنین کے لیے

(۱) اکثر مفسرین نے سورہ اعراف کی آیت نمبر ۱۷۵ کے تحت بلعم بن باعوراء کا قصہ بیان کیا ہے کہ وہ حضرت موسی علیہ السلام کی قوم کا ایک فرد تھا، اس کے علم و معرفت کا یہ عالم تھا کہ جب وہ نظر اٹھاتا تو عرش تک دیکھ لیتا تھا، اس کی مجلس میں بارہ ہزار دوات رکھی رہتی تھیں اور یہ ان طلبہ کی ہوتی تھیں جو ان کے درس میں بیٹھ کر ان سے سنے ہوئے علمی نکات لکھا کرتے تھے۔ اس سے ان کے حلقہ درس کی وسعت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے! لیکن اللہ تعالی کی نظر عنایت اس پر سے ہٹی اور وہ گمراہیت کے اس دلدل میں جا پھنسا کہ جس نے سب سے پہلے خدا کے انکار اور عالم کے خود بخود وجود میں آنے پر کتاب لکھی وہ یہی شخص تھا۔ مالک ابن دینار رحمۃ اللہ علیہ اس کا قصہ بیان فرماتے ہیں کہ اسے مدین کے بادشاہ کے پاس اس لیے بھیجا گیا تا کہ وہ اسے ایمان کی دعوت دے، لیکن اس نے اسے مال و دولت کا لالچ دیا، اس لالچ میں آکر اس نے دین موسی چھوڑ دیا اور اس بادشاہ کے دین کو اختیار کر لیا۔ امام ابو حامد غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "منہاج العارفین" میں لکھا ہے کہ میں نے بعض عارفین کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ کسی نبی نے اللہ تعالی سے سوال کیا کہ اے میرے رب ذوالجلال! آخر بلعم بن باعوراء پر اتنی نوازشیں اور اس کو اتنی کرامتیں اور فضل و مرتبہ دینے کے بعد یہ سب کچھ اس سے تو نے کیوں چھین لیا؟ تو بارگاہ الہی سے جواب آیا کہ اس نے کبھی بھی ان نعمتوں پر میرا شکر ادا نہیں کیا، اگر وہ ان نعمتوں پر ایک بار بھی میرا شکر ادا کرتا تو میں یہ سب کبھی اس سے نہیں چھینتا۔ (تفسیر قرطبی) اللہ تعالی ہمیں مصیبت میں صبر اور خوشی میں شکر کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمارا خاتمہ ایمان پر فرمائے!

مغفرت طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے لہذا ان کی اقتدا کرنا ہم پر واجب ہے۔

ہمیں ان کے بارے میں خوف لگا رہے گا۔

یعنی اہلِ ایمان میں سے جو گنہگار ہیں ہمیں ان کے عذاب کا خوف لگا رہے گا، کیوں کہ اللہ تعالی نے اپنے اوامر کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے عذاب کی وعید فرمائی ہے لہذا جس طرح اپنے لیے ہم مغفرت طلب کرتے ہیں بالکل اسی طرح ان کے لیے بھی مغفرت طلب کرتے رہیں گے جس طرح اپنے لیے خوف کھاتے ہیں بالکل اسی طرح ان کے لیے بھی خوف کھاتے رہیں گے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے: **مومنین کی مثال ایک جسم کی ہے، جب اس کا کوئی ایک عضو تکلیف میں ہوتا ہے تو پورا جسم بخار اور کم خوابی کے اثر سے تڑپتا ہے**[1]۔

(لیکن ان کے گناہوں کے باوجود) ان کے بارے میں رحمتِ الٰہی سے ہم مایوس نہیں ہوں گے۔

اس لیے کہ رحمت الٰہی سے مایوس ہونا گمراہوں کا شیوہ ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَمَن يَقْنَطُ مِن رَّحْمَةِ رَبِّهِۦٓ إِلَّا ٱلضَّآلُّونَ﴾ [حجر:۵۶] "اپنے رب کی رحمت سے گمراہوں کے سوا کوئی مایوس نہیں ہوتا ہے"۔

بے خوفی اور ناامیدی یہ دونوں ہی چیزیں مذہب اسلام سے نکال سکتی ہیں۔

یعنی اللہ کی خفیہ تدبیر سے بے خوف ہو جانا اور اسی طرح اس کی رحمت سے ناامید ہو جانا دونوں ہی چیزیں ایک مومن کو دینِ اسلام سے نکال کر صحرائے کفر میں لے جا کر کھڑا

(۱) أخرجه مسلم (۲۵۸۶).

کر دیتی ہیں، کیوں کہ اللہ تعالی نے جہاں رحمت کا وعدہ فرمایا ہے وہیں پر عذاب کی وعید بھی سنائی ہے اور وہ دونوں پر برابر قادر ہے، کیوں کہ بندے کا اللہ تعالی کی وعید سے بے خوف ہو جانا اس کی طرف سے یہ اعلان ہے کہ کہیں نہ کہیں اس کے گمان میں اس یقین نے جڑ پکڑی رکھی ہے کہ اللہ تعالی اس کو سزا دینے سے عاجز ہے، اسی طرح اس کا رحمت خداوندی سے مایوس ہو جانا اس بات کا پتا ہے کہ ہو نہ ہو اس کو اس بات کا وہم ہو چلا ہے کہ خداوند غفار چاہ کر بھی اس کی مغفرت نہیں کر سکتا اور یہ دونوں ہی خیال دینِ اسلام سے اس کو باہر کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿أَفَأَمِنُواْ مَكْرَ ٱللَّهِۚ فَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ ٱللَّهِ إِلَّا ٱلْقَوْمُ ٱلْخَـٰسِرُونَ﴾ [اعراف:۹۹] "کیا وہ اللہ کی خفیہ تدبیر سے بے خوف ہو گئے ہیں تو سوائے خسارہ اٹھانے والوں کے اللہ کی خفیہ تدبیر سے کوئی بھی بے خوف نہیں ہوتا"۔ رحمتِ الہی سے مایوسی کے سلسلے میں ارشاد باری تعالی ہے: ﴿إِنَّهُۥ لَا يَاْيۡـَٔسُ مِن رَّوۡحِ ٱللَّهِ إِلَّا ٱلۡقَوۡمُ ٱلۡكَـٰفِرُونَ﴾ [یوسف:۸۷] "کافروں کے سوا کوئی دوسرا اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتا"۔

اہل قبلہ کے لیے ان دونوں کے درمیان کا راستہ ہی حق کا راستہ ہے۔

یعنی امن و یاس اور امید و بیم کے بیچ کی جو ڈگر ہے اہل حق اسی کے راہی ہیں۔

[لب دوختہ کش مکش بیم و رجا ہوں اقرار نہ لب پر ہے نہ انکار خطا کا]

اور یہی عبودیت کی حقیقت بھی ہے ارشاد باری تعالی ہے: ﴿يَدۡعُونَ رَبَّهُمۡ خَوۡفًا وَطَمَعًا﴾ [سجدہ:۱۶] "وہ اپنے رب کو خوف و امید میں پکارتے ہیں"۔ یعنی اس کے عقاب کا خوف اور اس کے ثواب و رحمت کی امید میں اس کو پکارتے ہیں۔ ارشاد نبوی ﷺ

ہے: "اگر مومن کا خوف اور اس کی رجا (ثوابِ الٰہی کی امید) ایک ترازو پر رکھے جائیں تو اس کے دونوں پلڑے برابر رہیں گے۔

اور اس عبارت میں خوارج اور مُرجئہ[1] کے اس عقیدے کی تردید ہے کہ خوارج گناہ کبیرہ کرنے کے بعد رحمت الٰہی سے مایوس ہو گئے اور مرجئہ گناہ کبیرہ کرنے کے بعد عذابِ الٰہی سے بے خوف رہے، اس طرح سے وہ دونوں ہی افراط و تفریط کا شکار ہو گئے جب کہ سبھی امور میں میانہ روی اختیار کرنا ہی صراط مستقیم ہے۔

بندہ اس وقت تک ایمان سے نہیں نکلتا جب تک اس چیز کا انکار نہ کردے جس نے اس کو اس (ایمان) میں داخل کیا تھا۔

کیوں کہ کفر و ایمان دو متضاد چیزیں ہیں لہذا دونوں میں ایک کا وجود اس وقت تک ختم نہیں ہوگا جب تک اس کی جگہ پر دوسرا نہ آجائے اور مومن چوں کہ تصدیق و اقرار سے ہی ایمان میں داخل ہوا تھا اس لیے وہ اس وقت تک دائرہ کفر میں داخل نہیں ہوگا اور حلقہ ایمان سے باہر نہیں نکلے گا جب تک اس کے مقابلے میں انکار اور پھر تکذیب نہ کرے۔

---

(۱) مرجئہ: یہ ایک فرقہ ہے، جو سیاسی اسباب کی بنا پر صحابہ کرام کے آخری دور میں ظہور میں آیا، پھر آگے جا کر جہم بن صفوان نے اس فرقے کے نظریات کو آگے بڑھایا اور اس میں غلو سے کام لیا۔ ان کے بہت سے عقائد، عقائدِ اہل سنت کے مخالف ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ ایمان کے باب میں صرف معرفت کافی ہے، تصدیق واقرار اور اعمال اس کے لیے شرط نہیں ہیں اور یہ کہ جس طرح کفر کے ساتھ کسی عمل کا کوئی فائدہ نہیں اسی طرح ایمان لانے کے بعد کسی گناہ کا کوئی نقصان نہیں وہ گناہ خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، اور اس کے بارے میں حتمی فیصلہ اللہ تعالی پر چھوڑ دیا جائے اور آخرت میں اس کے بارے میں اچھے معاملات کی "رجا" یعنی امید رکھی جائے، اسی رجا یعنی امید کی وجہ سے ان کو مرجئہ کہتے ہیں۔

اس لیے ایک مومن سے اگر اعتقادِ جازم، تصدیقِ پیہم اور ایمانِ راسخ کے ہوتے ہوئے کوئی کبیرہ گناہ سرزد ہو گیا، تو صرف اس کی وجہ سے وہ دائرہ ایمان سے نہیں نکلے گا، لہٰذا جب تک کسی مومن کے بارے میں یہ یقین کامل نہ ہو جائے کہ وہ اس چیز کا انکار کر بیٹھا ہے جس سے وہ ایمان میں داخل ہوا تھا اس وقت تک اس پر کفر کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔

ایمان کی حقیقت

ایمان نام ہے زبان سے اقرار کرنے اور دل سے تصدیق کرنے کا۔

مشائخ کا حقیقتِ ایمان میں اختلاف رہا ہے کہ وہ نام کس چیز کا ہے؟

اس سلسلے میں شیخ ابو منصور ماتریدی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ حقیقت میں تو ایمان نام ہے تصدیق بالقلب کا، لیکن چونکہ دل کا معاملہ مخفی ہے اس پر کسی بھی صورت میں آگہی ممکن نہیں ہے، اسی لیے اللہ تعالی نے "اقرار باللسان" کو دل کا ترجمان بنایا اور دنیاوی احکام جاری کرنے کے لیے اسے ہی شرط قرار دیا، حتی کہ اگر وہ دل سے تصدیق کر دے لیکن زبان سے اقرار نہ کرے تو بھی وہ اللہ کے نزدیک مومن ہی رہے گا، کیوں کہ وہ تو دلوں کے چھپے راز کو بھی جانتا ہے، اس لیے اس کو اس کے دل کی تصدیق کی بھی خبر ہو گی، لیکن دنیاوی احکام جاری کرنے میں وہ مومن نہیں ہو گا کیوں کہ اس نے زبان سے اقرار کیا ہی نہیں، جس سے ہمیں اس کے ایمان کا پتا چلتا، ہم تو صرف ظواہر پر ہی حکم لگا سکتے ہیں باطن کا ذمہ دار تو صرف اللہ ہی ہے اور یہی قول امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے ان کی کتاب "العالم والمتعلم" میں مروی ہے۔

شمس الائمہ [1] اور فخر الاسلام [2] رحمۃ اللہ علیہما کا یہ قول ہے کہ اقرار باللسان بھی تصدیق کی طرح ہی ایمان کا ایک رکن ہے بس فرق اتنا ہے کہ وہ رکن زائد ہے جو جبر کیے جانے یا کسی مجبوری کی حالت میں سقوط کا احتمال رکھتا ہے اور تصدیق اس کا رکن اصلی ہے جو کسی بھی حال میں سقوط کا احتمال نہیں رکھتا، لہذا جس نے دل سے تصدیق کی، پر بلا کسی عذر کے زبان سے اقرار نہیں کیا تو وہ مومن نہیں ہوگا۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام میں اسی نقطے کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ انہوں نے فرمایا: **ایمان نام ہے اقرار باللسان اور دل سے تصدیق کرنے کا۔**

یہ بات بھی ہمیں فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اعمال ایمان کی حقیقت میں داخل نہیں ہیں، جیسا کہ بعض علما کا مذہب ہے چنانچہ انہوں نے ایمان کی تعریف یہ فرمائی ہے:

---

(۱) ان کا پورا نام عبد العزیز بن احمد بن نصر حلوانی، کنیت ابو محمد اور لقب "شمس الائمہ" ہے۔ اسی لقب سے آپ نے شہرت پائی، برصغیر میں ان کے نام کے آگے "حلوائی" لگایا جاتا ہے جو کہ لفظ "حلوانی" کا حرفی ترجمہ ہے۔ آپ کو حلوانی یا پھر حلوائی اس لیے کہا جاتا ہے کیوں کہ آپ کے والد پیشے سے حلوائی تھے۔ اس سلسلے میں امام زرنوجی نے اپنی کتاب "تعلیم المتعلم" میں ان کے حوالے سے ایک بڑا دلچسپ واقعہ نقل فرمایا ہے کہ ان کے والد بزرگوار حلوا بنا کر علمائے کرام کی بارگاہ میں تحفتاً پیش کیا کرتے تھے اور ان سے عرض کرتے تھے کہ میرے بیٹے کے لیے بھی دعا کریں کہ اس کو بھی آپ جیسا علم عطا ہو جائے، پھر وہ ان کے بیٹے کے لیے دعا کرتے، انہیں کی دعاؤں کی برکتیں تھیں کہ آگے چل کر ان کے بیٹے "شمس الائمہ" کہلائے۔ آپ اپنے وقت میں بخارا کے اہل رائے علما کے امام تھے۔ آپ کی تصانیف میں "المبسوط فی الفقہ" کو بڑی شہرت ملی۔ آپ کا سن وفات: ۴۴۸ھ ہے۔

(۲) آپ کا پورا نام علی بن محمد بن حسین بزدوی کنیت ابو محمد اور لقب فخر الاسلام ہے۔ آپ فقیہ، اصولی، محدث اور مفسر تھے، آپ کی تصانیف میں "شرح الجامع الکبیر للامام محمد" اور "اصول البزدوی" بہت مشہور ہیں۔ آپ کا سن وفات: ۴۸۲ھ ہے۔

ایمان نام ہے دل سے تصدیق کرنے، زبان سے اقرار کرنے اور ارکانِ (اسلام) پر عمل کرنے کا۔ اور یہ تعریف امام شافعی، امام احمد رحمۃ اللہ علیہما اور ظاہری حضرات کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ(۱) نے فرمایا: اعمال ایمان کی حقیقت سے خارج ہیں۔

اس کے بعد جو اس بات کے قائل ہیں کہ اعمال ایمان میں داخل ہیں ان کے درمیان اس بات کو لیکر (گناہ کبیرہ کے مرتکب کے مسئلہ میں) اختلاف ہو گیا کہ کیا وہ صرف اس گناہ کے سبب ایمان سے نکلے گا یا نہیں؟ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: فسق ایک فاسق کو ایمان سے نہیں باہر کرتا لیکن ان کے اس قول میں بہت بڑا اشکال ہے اور وہ یہ کہ جب آپ نے یہ مان لیا کہ ایمان: تصدیق، اقرار اور اعمال کے مجموعے کا نام ہے، تو ان میں سے کسی ایک چیز کے زائل ہونے سے کل کا خاتمہ ہو جائے گا اور اس صورت میں لازم یہ آئے گا کہ بغیر اعمال کے وہ مومن ہی نہ رہ جائے۔

ہماری دلیل یہ ہے: قرآن میں بہت ساری جگہوں پر ایمان کا عطف اعمال پر کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿إِنَّ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَعَمِلُواْ ٱلصَّٰلِحَٰتِ﴾ [بقرہ: ۲۷۷] "بے شک وہ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کیے"۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿ٱلَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِٱلْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ ٱلصَّلَوٰةَ﴾ [بقرہ:۳] "جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں

---

(۱) ان کا پورا نام محمد بن حسین اور کنیت ابو عبد اللہ اور فخر الدین الرازی لقب ہے۔ آپ فقہ میں شافعی، عقیدے میں اشعری تھے۔ یوں تو آپ کو تمام عقلی و نقلی علوم میں مہارت حاصل تھی، لیکن آپ کی شہرت علم کلام اور علم تفسیر میں ہوئی۔ علوم نقلیہ اور عقلیہ میں آپ اپنے زمانے میں اپنی مثال آپ تھے۔ یوں تو آپ کی تصانیف کی فہرست بہت طویل ہے، لیکن ان میں: مفاتیح الغیب فی تفسیر القرآن، تاسیس التقدیس اور المحصول فی علم اصول الفقہ، کو غیر معمولی شہرت ملی۔ آپ کا سن وفات: ۶۰۶ھ ہے۔

اور نماز ادا کرتے ہیں"۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَٰجِدَ ٱللَّهِ مَنْ ءَامَنَ بِٱللَّهِ وَٱلْيَوْمِ ٱلْءَاخِرِ وَأَقَامَ ٱلصَّلَوٰةَ﴾ [توبہ:۱۸] "اللہ کی مسجدیں وہ آباد کرتے ہیں جو اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور نماز ادا کرتے ہیں"۔ اور معطوف معطوف علیہ کے درمیان "غیریت" ہوتی ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے: ایمان صحتِ اعمال کے لیے شرط ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَمَن يَعْمَلْ مِنَ ٱلصَّٰلِحَٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ﴾ [طٰہٰ:۱۱۲] "اور جو نیک اعمال کرے جب کہ وہ ایمان والا ہو"۔ اور شرط و مشروط کے درمیان بھی غیریت ہوتی ہے۔

اور تیسری دلیل یہ ہے: جبریل علیہ السلام نے جب نبی ﷺ سے ایمان کی بابت سوال کیا تو آپ ﷺ نے اس کے جواب میں فلاں فلاں چیز کی تصدیق کے سوا کسی دوسری (عملی) چیز کا ذکر نہیں کیا۔ حدیث کے الفاظ ملاحظہ ہوں: ایمان یہ ہے کہ تم اللہ کی، اس کے فرشتوں کی، اس کی کتابوں کی، اس کے رسولوں کی اور یوم آخرت کی دل سے تصدیق کرو اور ساتھ ہی ساتھ قدر کے اچھے اور برے ہونے کی تصدیق کرو۔ پھر اخیر میں ارشاد فرمایا: یہ جبریل تھے جو تمھیں تمہارے دین کے شعار سکھانے آئے تھے اگر تصدیق اور اقرار کے ساتھ ساتھ اعمال بھی ایمان میں داخل ہوتے تو نبی ﷺ ان کا ذکر ضرور فرماتے۔

اور جو شریعت اللہ نے قرآن میں نازل فرمائی اور جس شریعت کا بیان رسول اللہ ﷺ سے صحیح روایت کے ذریعہ ثابت ہے، وہ سب کا سب حق ہے۔

کیوں کہ جب یہ ثابت ہو گیا کہ قرآن اللہ کی جانب سے نازل ہوا ہے اور رسول سچے ہیں تو اسی سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ قرآن کے ذریعہ جو بھی شریعت نازل ہوئی اور اس کو

بیان کرنے میں نبی ﷺ سے جو بھی صحیح روایات وارد ہوئی ہیں وہ سب کی سب حق ہیں، کیوں کہ آقا ﷺ جھوٹ اور بہتان تراشی سے معصوم ہیں۔

اس عبارت کو ذکر کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی، کیوں کہ نبی ﷺ جو کچھ بھی لے کر آئے اس پر ایک ایک کر کے تفصیل کے ساتھ ایمان لانا ممکن نہ تھا اس عذر کے پیش نظر جن چیزوں پر اجمالاً ایمان لانا واجب تھا ان پر اجمالاً ایمان لانا واجب ہے اس لیے کہ اگر انسان پر تفصیلی طور پر ایمان لانا واجب کر دیا جاتا تو یقیناً کچھ نہ کچھ ایسا ضرور چھوٹ جاتا جس پر ایمان لانا واجب تھا! اس لیے ایک مکلَّف کا شریعت کے سبھی احکام کا تفصیلی احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے۔

اصل ایمان نہ تو بڑھتا ہے اور نہ ہی گھٹتا ہے

ایمان ایک ہے اور جتنے بھی اہلِ ایمان ہیں سب کے سب اصلِ ایمان میں برابر ہیں، ان کے درمیان ایک دوسرے پر جو فضیلت ہے وہ خشیت، تقوی، خواہشِ نفس کی مخالفت کرنے اور جو اولی ہے ہمیشہ اس پر عمل کرنے کے سبب ہے۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ جو فرمایا کہ ایمان ایک ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان در حقیقت نام ہے نبی ﷺ کی لائی ہوئی سبھی چیزوں کی دل سے تصدیق کرنے کا اور اس میں مکلفین کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

اور امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فرمانا کہ اہلِ ایمان اصل ایمان میں برابر ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل آسماں یعنی ملائکہ کا ایمان اور اہل زمین یعنی انس و جن کا ایمان اصل کے اعتبار سے ایک ہے اور اصل ایمان یہ ہے کہ عقیدہ توحید کو دل سے مانا جائے، اللہ تعالی کی ذاتی و فعلی صفات کا دل سے اقرار ہو اور جن چیزوں پر اجمالاً ایمان لانا واجب ہے ان پر

اجمالاً ایمان لایا جائے اور ظاہر ہے تمام مکلفین اس امر میں یکساں ہیں۔

اسی کی طرف امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "العالم والمتعلم" میں اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: یقیناً ہمارا ایمان اصل کے اعتبار سے ملائکہ کے ایمان کی طرح ہے اس لیے کہ ہم بھی اسی طرح سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، اس کی ربوبیت اور جو بھی اس کی جانب سے آیا اس پر ایمان لائے جس طرح سے ملائکہ اور انبیاء و رُسل نے اس کی تصدیق اور اقرار کیا، اس لیے ہمارا ایمان بھی انہیں کے ایمان کی طرح ہو گا۔ پھر اس کے بعد جو ان کو ہم پر فضیلت حاصل ہے وہ ایمان پر ثواب اور دوسری تمام عبادات میں ہے جو کہ اصول ایمان کے ماسوا ہیں۔ کیوں کہ جس طرح سے اللہ تعالیٰ نے نبوت کے ذریعہ ان کو لوگوں پر فضیلت بخشی ہے اسی طرح سے ان کی عبادت و ثواب کو بھی فضیلت عطا فرمائی ہے اور ان کو اپنی امانت سونپی ہے، اس لیے کوئی بھی انسان عبادت اور خوفِ الٰہی میں ان کی برابری نہیں کر سکتا۔

یہ ساری باتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ اصل ایمان نہ تو گھٹتا ہے اور نہ ہی بڑھتا ہے، کیوں کہ اصل ایمان یہ ہے کہ جن چیزوں پر ایمان لانا واجب ہے ان کی دل سے تصدیق کر لی جائے اور اس میں زیادتی و کمی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اور ایمان کی وہ زیادتی جو اللہ تعالیٰ کے قول: ﴿زَادَتْهُمْ إِيمَـٰنًا﴾ [انفال:۲] "ان کا ایمان زیادہ ہو گیا"۔ اور ﴿لِيَزْدَادُوٓاْ إِيمَـٰنًا﴾ [فتح:۴] "وہ ایمان میں زیادہ ہو گئے"۔ اور اسی طرح دوسری جگہوں پر وارد ہوئی ہے تو اس سے اعمال صالحہ کی وجہ سے ثمراتِ ایمان میں اضافہ، نورِ ایمان کی بالیدگی اور اس کی پاکیزگی و نکہت میں زیادتی مراد ہے۔

ارشاد باری تعالی ہے: ﴿أَفَمَن شَرَحَ ٱللَّهُ صَدۡرَهُۥ لِلۡإِسۡلَٰمِ فَهُوَ عَلَىٰ نُورٍ مِّن رَّبِّهِۦ﴾ [زمر:۲۲] "تو کیا وہ جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا پس وہ اپنے رب کی جانب سے نور پر ہے (کیا اس کی طرح ہے جس کے دل پر مہر لگ چکی ہے؟)" نہ یہ کہ اس سے مراد اصل ایمان میں زیادتی ہے، ورنہ دونوں دلیلوں پر عمل کیسے ہو گا!؟ اسی نکتے کی طرف امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اس قول میں اشارہ فرمایا ہے: **ان کے درمیان جو ایک دوسرے پر فضیلت اور ایک دوسرے کے مرتبے میں فرق دیکھنے کو ملتا ہے وہ در حقیقت ایمان کے نور اور اس کی ضیا، یقین کی زیادتی اور خواہشات نفسانیہ سے بچنے اور قول و فعل میں ہمیشہ اولی پر عمل کرنے جیسے اوصاف میں ہے۔**

تمام مومنین رحمٰن کے اولیا ہیں، لیکن ان میں بھی اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والے وہ لوگ ہیں جو ان میں سب سے بڑھ کر قرآن کی اطاعت اور اس کی اتباع کرنے والے ہیں۔

ارشاد باری تعالی ہے: ﴿ٱللَّهُ وَلِيُّ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ﴾ [بقرہ:۲۵۷] "اللہ ایمان والوں کا حامی و نگہبان ہے"۔ اور ولی "فَعِیل" کے وزن پر ہے، جو کہ اسم فاعل کے معنی میں ہے، یعنی اللہ ان کے امور کا ذمہ دار اور ان کا ناصر ہے اور مدد و اعانت، توفیق بر طاعت اور ہدایت بسوئے معرفت، کے لحاظ سے ان سے قریب ہے۔ اور اس بات پر دلیل کہ ان میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ شخص ہے جو سب سے زیادہ اطاعت گزار ہو، اللہ تعالی کا یہ ارشاد ہے: ﴿إِنَّ أَكۡرَمَكُمۡ عِندَ ٱللَّهِ أَتۡقَىٰكُمۡ﴾ [حجرات:۱۳] "تم میں جو سب سے زیادہ تقوے والا ہے بے شک وہی اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت

والا ہے"۔ اور اسی مناسبت سے ارشاد نبوی ﷺ بھی ملاحظہ ہو: "تقوے کے بغیر کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے"[۱]۔ اور قرآن کی اتباع ہی اطاعت و تقوی پر سب سے بڑی دلیل ہے۔

اور اصل ایمان ہے اللہ تعالی پر، اس کے ملائکہ پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، یوم آخرت پر، مرنے کے بعد اٹھائے جانے پر؛ ایمان لانا اور اس بات پر ایمان لانا کہ اچھا برا، میٹھا کڑوا، جو بھی تقدیر میں ہے سب اللہ کی جانب سے ہے اور ہم ان تمام باتوں پر ایمان رکھتے ہیں، اس کے رسولوں میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے، بلکہ وہ سب کے سب جو کچھ بھی اللہ کی طرف سے لے کر آئے ان سب میں ان کو سچا مانتے ہیں۔

چوں کہ اس سے پہلے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ یہ ذکر کر چکے تھے کہ اہل ایمان اصل ایمان میں برابر ہیں، اس لیے یہاں پر اصل ایمان کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اصل ایمان یہ ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ۔۔۔ لہذا پہلے اجمالی طور پر ذکر کرنے کے بعد یہاں پر تفصیلی طور پر اسی بات کا ذکر فرمایا۔ اور اس عقیدے کی اصل اس آیت سے ملتی ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿ءَامَنَ ٱلرَّسُولُ﴾ [بقرہ:۲۸۵] "رسول ایمان لائے۔۔۔"[۲] اور حدیث جبریل

---

(۱) أخرج نحوه أحمد (٢٣٥٣٦)، والطبراني في الأوسط (٤٧٤٩).

(۲) پوری آیت یہ ہے: ﴿آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ﴾ [بقرہ:۲۸۵] "رسول اس پر ایمان لائے جو ان پر ان کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا اور ایمان والے، سب کے سب ایمان لائے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر"۔

بھی اس عقیدے پر شاہد ہے، جس میں حضرت جبریل علیہ السلام نے نبی ﷺ سے ایمان کے بارے میں سوال کیا تھا جس کا تفصیلی ذکر اس سے پہلے گزر چکا ہے۔

گناہ کبیرہ کرنے والوں کا آخرت میں انجام

گناہِ کبیرہ کرنے والے اگر توحید کا اقرار کرتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوئے تو جہنم میں ہمیشہ ہمیش نہیں رہیں گے اگرچہ انہوں نے توبہ نہ کی ہو، بس شرط اتنی سی ہے کہ وہ عقیدہ توحید پر اللہ سے ملے ہوں۔

کسی مسلمان سے اگر گناہ کبیرہ سرزد ہو جائے پھر اگر توبہ سے پہلے ہی اس کا انتقال ہو جائے، لیکن اس کا خاتمہ عقیدہ توحید پر ہی ہوا ہو، اس نے شرک نہ کیا ہو، تو وہ اگرچہ جہنم میں جائے گا، لیکن اس میں ہمیشہ ہمیش نہیں رہے گا، بلکہ آخر میں اس کا انجام کار یہ ہو گا کہ اسے جہنم سے نکال کر جنت میں بھیج دیا جائے گا۔

اس میں معتزلہ کی تردید ہے، جن کا یہ ماننا ہے کہ ایسا شخص جہنم میں ہمیشہ ہمیش رہے گا اس سے کبھی بھی باہر نہیں آئے گا۔ اور اس اختلاف کا سبب یہ ہے کہ ہمارے یہاں گناہ کبیرہ کا مرتکب ایمان سے نہیں نکلتا اور ان کے یہاں اس سے نکل جاتا ہے لہذا اگر اس نے توبہ نہیں کی تو وہ ان کے نزدیک کافر ہی رہے گا۔[1] اسی لیے وہ جہنم میں ہمیشہ ہمیش رہے گا اس کی تحقیق اس سے پہلے گزر چکی ہے۔

---

(۱) صحیح یہ ہے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ان کے نزدیک ایمان سے نکل جاتا ہے لیکن کفر میں داخل نہیں ہوتا لہذا ایمان سے نکل جانے کی وجہ سے اسے جہنم میں ہمیشہ ہمیش رہنا پڑے گا اور کفر میں داخل نہ ہونے کی وجہ سے اسے کافروں سا عذاب نہیں ہو گا بلکہ کفار کی نسبت اس کے عذاب میں قدرے تخفیف ہو گی۔
(مستفاد از استاذ محترم دکتور عرفہ نادی حفظہ اللہ استاذ العقیدہ والفلسفہ، جامعۃ الازہر، مصر۔)

اور ہمارے نزدیک چوں کہ وہ مومن ہی رہے گا اس لیے جہنم میں ہمیشہ ہمیش اسے نہیں رہنا پڑے گا اور اس کا انجام کار آخر میں جنت ہی ہو گا۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿إِنَّ الَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَعَمِلُوا۟ ٱلصَّٰلِحَٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّٰتُ ٱلْفِرْدَوْسِ نُزُلًا﴾ [کہف: ۱۰۷] "وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک کام کیے یقیناً ان کی مہمان نوازی کو فردوس کے باغات ہیں"۔ ایک شخص ہے جو ایمان بھی لایا نماز وروزہ کی شکل میں اعمالِ صالحہ بھی کیے لیکن نفسانی شہوات پر غلبہ نہ پا سکا اور گناہ کبیرہ کے جال میں جا پھنسا، پھر بھی وہ اس کی حرمت کا قائل تھا اور سزا سے ڈرتا تھا، اس وجہ سے اخیر میں اس کا انجام جنت ہی ٹھہرے گا۔

ارشاد باری تعالی ہے: ﴿إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِۦ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَآءُ﴾ [نساء:۴۸] "ایک شرک کو چھوڑ کر جو گناہ اللہ چاہے گا بے شک اسے معاف کر دے گا"۔ اس آیت میں اللہ تعالی نے شرک وغیر شرک میں فرق کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ شرک ہی ایک ایسا گناہ ہے جو ناقابلِ معافی ہے، اس کے سوا جو بھی گناہ ہے وہ اگر چاہے تو معاف کر سکتا ہے، کیوں کہ اللہ تعالی نے اس آیت میں مغفرت کو مشیت سے متعلق کیا ہے اور جو چیز مشیت سے متعلق ہو اس کا وجود ممکن ہوتا ہے محال نہیں، لہذا اللہ رحمٰن ورحیم کی رحمت سے کوئی بعید نہیں کہ وہ گناہ کبیرہ کو بھی معاف کر کے اسے جہنم میں جانے سے بچالے یا پھر اسے پہلے جہنم میں ڈالے، پھر اپنی رحمت سے اس کو اس عذاب سے بخشش کا پروانہ دے دے۔

ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلَىٰ ظُلْمِهِمْ﴾ [رعد:

۲]" بے شک تمہارا رب لوگوں کو ان کے ظلم کے باوجود معاف فرمانے والا ہے"۔ یعنی ظلم کی حالت میں ہونے کے باوجود وہ اگر چاہے تو معاف فرما سکتا ہے اور یہ آیت اس بات کی شاہد ہے کہ توبہ سے پہلے بھی مغفرت کا امکان ہے! اور اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ جب لمحہ بھر کے لیے توحید کا اقرار سیکڑوں سال کے کفر کو مٹا سکتا ہے تو یہی اقرار ایک پل کی معصیت کو کیوں نہیں مٹا سکتا!؟ لیکن چوں کہ گناہ کبیرہ کرنے والوں کے لیے عذاب اور ان کی سزا نصوص سے ثابت ہے اس لیے معافی کی امید تو کم از کم لگائی ہی جا سکتی ہے! ارشاد باری تعالی ہے: ﴿إِنَّ ٱللَّهَ يَغْفِرُ ٱلذُّنُوبَ جَمِيعًا﴾ [زمر:۵۳]"یقیناً اللہ تعالی تمام گناہوں کو معاف کر دے گا"۔

اس پر ایک اور دلیل ملاحظہ فرمائیں: ﴿فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُۥ ۝٧ وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُۥ﴾ [زلزلہ:۷،۸]"تو جو ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اسے دیکھے گا اور جو ذرہ برابر بدی کرے گا وہ بھی اسے دیکھے گا"۔ لہذا جو ایمان لایا اور نیک کام کیے لیکن گناہوں سے بچ نہ سکا تو اگر وہ جہنم سے نہیں نکلے گا تو پھر اپنے ایمان و اعمال کا ثواب کیسے دیکھے گا!؟ اور اس میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ اس آیت میں دونوں طرح کی جزا کو عمومی طور پر بیان کیا گیا ہے لہذا دونوں کا جمع کرنا ضروری ہے، اس کو دیکھتے ہوئے اب ہمارے پاس دو احتمال ہیں یا تو ہم یہ کہیں کہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب پہلے اپنے ایمان کی وجہ سے جنت میں بھیجا جائے گا پھر اپنے گناہوں کے سبب وہاں سے نکال کر جہنم میں منتقل کیا جائے گا جو کہ باطل ہے۔

اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ یا تو ہم یہ کہیں کہ پہلے اپنے گناہ کے چلتے وہ جہنم میں جائے

گا پھر ایمان کے صدقے وہ جنت میں منتقل کیا جائے گا اور یہی حق ہے۔

اور وہ یعنی اہل کبائر اس کی مشیئت اور اس کے حکم کے تابع ہیں اگر وہ چاہے تو اپنے فضل سے ان کی مغفرت فرما کر انہیں معافی نامہ دے دے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَآءُ﴾ [نساء:۴۸] "اس کے یعنی شرک کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ اسے معاف فرما دے گا"۔ یعنی نہ تو کبیرہ گناہ کرنے والوں کی سزا کے بارے میں یقین سے کہا جا سکتا ہے اور نہ ہی ان کی جزا کے بارے میں کوئی یقین سے کہہ سکتا ہے، بلکہ ان سب کا حکم یہ ہے کہ اگر وہ توبہ سے پہلے وفات پا گئے تو ان کی معافی اور مغفرت مشیئت الٰہی کے سپرد ہے، اگر وہ چاہے تو محض اپنے فضل و رحمت سے یا اپنے کسی نبی کی شفاعت سے یا پھر اپنے کسی محبوب بندے کی سفارش سے اسے معاف فرما دے اور اگر چاہے تو ان کے گناہوں کے برابر انہیں عذاب دے اور پھر انہیں جنت میں داخل کر کے برسوں کے عذاب کی سیاہی پل میں کافور کر دے!

اور اس عبارت میں خوارج و معتزلہ کی تردید ہے جو کہ اس بات کے قائل ہیں کہ ایسے لوگوں کو عذاب دیا جانا یقینی ہے، اگر وہ بغیر توبہ کے مر گئے تو ان کو معاف نہیں کیا جا سکتا۔ اور اسی میں مرجئہ کی بھی تردید ہے جن کا یہ گمان ہے کہ جو شخص ایمان لے آیا وہ کبھی بھی جہنم میں داخل نہیں ہو گا چاہے وہ دنیا کے سارے گناہ ہی کیوں نہ کر ڈالے، اور توبہ بھی نہ کرے، ایسے ہی اس دنیا سے رخصت ہو جائے!

پہلے گروہ کی تردید کی طرف اس عبارت میں اشارہ ہے "**اگر وہ چاہے تو اپنے فضل سے ان کی مغفرت فرما کر انہیں معافی نامہ دے دے**"۔ اور دوسرے گروہ کی تردید کی طرف آنے والی اس عبارت میں اشارہ ہے:

اور اگر چاہے تو اپنے عدل سے، پہلے انہیں عذاب دے، پھر انہیں اپنی رحمت اور اپنے اطاعت گزار بندوں کی شفاعت سے وہاں سے نکال کر اپنی جنت میں داخل کرے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کبھی بھی ان لوگوں کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا جن لوگوں کو اس کی معرفت حاصل ہو اور نہ ہی اس نے ان کا ٹھکانہ دنیا و آخرت میں ایمان و معرفت کے ان منکرین کے ساتھ بنایا ہے جو اس کی ہدایت سے محروم رہے اور جس وقت اس کی رحمت کی بَرکھا، رِم جھم برس رہی تھی اس وقت وہ کفر و انکار کے چھجے تلے کہیں دُبکے بیٹھے تھے۔

بہت ساری نصوص اس بات کی شاہد ہیں کہ آخرت میں "اہلِ معرفت" یعنی مسلمان اور "اہل انکار" یعنی کفار برابر نہیں ہوں گے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿أَمْ حَسِبَ ٱلَّذِينَ ٱجْتَرَحُوا۟ ٱلسَّيِّـَٔاتِ أَن نَّجْعَلَهُمْ كَٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَعَمِلُوا۟ ٱلصَّٰلِحَٰتِ﴾ [جاثیہ:۲۱] "کیا بدی (کفر) کرنے والوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہم ان کے ساتھ ایمان لانے والوں اور نیک کام کرنے والوں کا سا برتاؤ کریں گے؟" ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿أَمْ نَجْعَلُ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَعَمِلُوا۟ ٱلصَّٰلِحَٰتِ كَٱلْمُفْسِدِينَ فِى ٱلْأَرْضِ﴾ [ص:۲۸] "کیا ہم ایمان لانے والوں اور نیک کام کرنے والوں کو زمین میں فساد مچانے والوں کی طرح ٹھہرائیں گے"۔

اور چوں کہ حکمت کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ اہلِ معرفت کو اہلِ انکار پر فضیلت دی جائے لہٰذا اگر دونوں ہی جہنم میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے تو پھر دونوں کے درمیان فرق کی جو ریکھا تھی وہی ماند پڑ گئی اور تفریق کی جگہ برابری نے لے لی پھر کوئی بتلائے کہ ایمان و معرفت کا فائدہ کیا ہوا؟

گناہ کبیرہ کرنے والوں کو پہلے عذاب دیے جانے پھر شفاعت کرنے والوں کی شفاعت سے جہنم سے جنت کی طرف بھیجے جانے پر نبی ﷺ کی یہ حدیث پاک شاہد ہے:

رہے وہ جہنمی جو اس (جہنم) کے اہل ہیں، اس میں نہ تو انہیں موت آئے گی اور نہ ہی وہ زندہ رہ پائیں گے، لیکن وہیں کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو اپنے گناہوں کے سبب سے جہنم کی آتش کی لپٹ میں آجائیں گے، جس کے اثر سے وہ نام کے تو زندہ ہوں گے، لیکن حال مردوں سے بھی بدتر ہوگا حتی کہ جب وہ جل کر کوئلے کی طرح سیاہ ہو جائیں گے تو ان کی شفاعت کی اجازت دی جائے گی پھر انہیں ٹولی در ٹولی لا کر جنت کی نہروں میں چھوڑ دیا جائے گا اور اہلِ جنت سے کہا جائے گا: جنت والو! ان پر پانی بہاؤ جس کی فیض یابی سے وہ اس طرح سے نکھر اٹھیں گے جیسے سیلاب کے بعد سبزہ نکھر اٹھتا ہے[۱]۔ (بتخریج مسلم)

اسی کے ثبوت میں ایک اور حدیث نبوی ﷺ ملاحظہ ہو: محمد ﷺ کی شفاعت سے کچھ لوگ آتش دوزخ سے نکالے جائیں گے جن کو جہنمیوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہوگا پھر وہاں سے انہیں جنت میں منتقل کیا جائے گا[۲]۔ (بتخریج بخاری)

اے اللہ! اے اسلام کے نگہبان! ہمیں آخر وقت تک اسلام پر ثابت قدم رکھ حتی کہ اسی حال میں ہم تجھ سے آملیں۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے موت تک اسلام پر ثابت قدمی کی دعا اس لیے مانگی کیوں کہ "ابدی سعادت"- جو کہ جنت کے باغوں میں، جوارِ رحمت کے سائے میں، رحمت وریحان

---

(۱) أخرجه مسلم (۱۸۵).

(۲) أخرجه البخاري (٦١٩٨).

کی پر کیف نیر نگیوں اور بو قلمونیوں سے ہمیشہ ہمیش لطف اٹھانے کا نام ہے۔اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جب وہ آخری وقت تک اسلام پر ثابت قدم رہے اور اسی حالت میں اپنے رب سے جا ملے کیوں کہ بہر صورت اعتبار خاتمے کا ہی ہے۔اسی وجہ سے انبیائے کرام بھی معصوم ہونے کے باوجود اسلام پر ثابت قدمی اور اس پر خاتمے کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔

جب معصوم ہونے کے باوجود خود حضرت یوسف علیہ السلام نے ایمان پر خاتمے کی دعا مانگی، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصَّلِحِينَ﴾ [یوسف:۱۰۱] "مجھے اسلام کی حالت پر موت دے اور صالحین میں ملا دے"۔ تو دوسرے لوگوں کو بدرجہ اولی ان کی اقتدا میں دعا مانگتے رہنا چاہیے، کیوں کہ ان کی اقتدا ہی سب سے اچھی اقتدا ہے اور چوں کہ ایک مومن کی شان یہ ہے کہ وہ ہمیشہ امید و بیم کے درمیانی راستے پر چلتا رہے یہاں تک کہ دین اسلام پر ہی اس کا خاتمہ ہو جائے، اس لیے تا دم موت اسی پر ثابت قدمی کی دعا کا اہتمام کرنا لازمی ہے۔

<u>اور ہم اہل قبلہ میں سے ہر نیک و بد کے پیچھے نماز پڑھنے کو اور مرنے کے بعد ان میں سے ہر ایک کی نماز جنازہ پڑھنے کو جائز سمجھتے ہیں۔</u>

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: ہر نیک و بد کے پیچھے نماز پڑھو[1]۔

اور فاسق و فاجر کے پیچھے نماز نہ ہونے کے نظریہ سے یہ وہم سا ہوتا ہے کہ جیسے گناہ کبیرہ کرنے سے ایک مومن کافر ہو جاتا ہو، حالاں کہ اس کے بطلان کی دلیل اس سے پہلے

---

(۱) أخرجه البيهقي في السنن الكبرى (٦٨٣٢)، والدار قطني (١٧٦٨).

گزر چکی ہے۔

اور اس کی دلیل صحابہ کا عمل بھی ہے اس لیے کہ وہ بنی امیہ میں سے ظالم بادشاہوں کے پیچھے بھی نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔ اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ گناہوں سے معصوم اور پاک ہونا امامت کی صحت کے لیے شرط نہیں ہے جیسا کہ رافضیوں کا مذہب ہے۔(1)

اور رہی ان کی نماز جنازہ پڑھنے کی بات تو یہ خود نبی ﷺ کے فعل سے ثابت ہے جیسا کہ آپ ﷺ نے حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ پڑھی جب کہ زنا کرنے کے بعد خود آپ ﷺ نے ہی ان کو رجم کرنے کا حکم دیا تھا۔ اور چوں کہ نماز جنازہ حقوقِ اسلام میں سے ہے اور وہ شخص اب بھی مسلم ہی ہے، اپنے فسق کی وجہ سے ایمان سے باہر نہیں ہوا، اس لیے اب بھی اس کی نمازہ جنازہ پڑھی جائے گی۔

اور نہ ہی ہم ان میں سے کسی کو اپنی طرف سے جنت میں داخل کریں گے اور نہ ہی جہنم میں۔

یعنی کسی کے بارے میں ہم (یقین سے) یہ بات نہیں کہہ سکتے کہ وہ جنتی ہے اگر چہ اس نے نیک کام کیے ہوں یا وہ جہنمی ہے اگر چہ اس نے گناہ کیے ہوں، کیوں کہ خاتمہ امر

---

(1) ان کے نزدیک امامت کبری یعنی خلافت کے لیے عصمت شرط ہے۔ اور امامت صغری یعنی نماز کی امامت کے لیے "عدالت" کو شرط مانتے ہیں لہذا فاسق کے پیچھے ان کے نزدیک نماز درست نہیں ہوگی۔ اسی طرح ان کے نزدیک ایمان بھی امامت کے لیے شرط ہے، اور ولایت کا اقرار کرنا ان کے نزدیک ارکان ایمان میں سے ہے، لہذا غیر جعفری ان کے یہاں مومن نہیں ہے۔ اور اسی طرح بارہ اماموں کی امامت کا اعتراف بھی ان کے یہاں ایمان کا حصہ ہے، خلاصہ یہ کے غیر جعفری کے پیچھے ان کے نزدیک نماز نہیں ہوگی۔
(مستمسک العروۃ الوثقی۔ حکیم شیعی)

غیبی ہے جسے ایک اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اس لیے ممکن ہے کہ کوئی گنہ گار نیک بن کر مرے اور اس کا خاتمہ خیر پر ہو، اور اسی طرح یہ بھی امکانات میں شامل ہے کہ کوئی نیک گنہگار بن کر مرے اور اس کا خاتمہ شر پر ہو! حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جو تمہیں (بظاہر) معرفت والے اور خشوع والے دکھیں انہیں اپنی طرف سے جنتی نا بنا دیا کرو اور جو تمہیں (بظاہر) گنہ گار دکھیں انہیں اپنی طرف سے جہنم میں بھی نہ ڈال دیا کرو، جب تک کہ اللہ تعالی خود انہیں وہاں نہ بھیج دے۔

اور نہ ہم ان کو کافر بنائیں گے، نہ مشرک اور نہ ہی منافق جب تک کہ یہ ساری چیزیں خود ان کی جانب سے خوب ظاہر نہ ہو جائیں۔

کیوں کہ ہم صرف ظاہر پر حکم لگا سکتے ہیں اور رہا باطن تو اس کا ذمہ دار صرف اور صرف اللہ تعالی ہے اس لیے جسے ہم جانتے نہیں اس پر گواہی دینا بھی ہمارے لیے جائز نہیں ہو گا، ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: جب تم پر کوئی چیز سورج کی طرح روشن ہو جائے تبھی اس کی گواہی دو[1]۔ اور اس لیے کہ بغیر جانے بوجھے گواہی دینا ظن و تخمینے سے گواہی دینے کے مترادف ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿ٱجۡتَنِبُواْ كَثِيرٗا مِّنَ ٱلظَّنِّ إِنَّ بَعۡضَ ٱلظَّنِّ إِثۡمٞ﴾ [حجرات:۱۲] "بہت زیادہ گمان لگانے سے بچو بے شک بعض چیزوں کا گمان گناہ ہوتا ہے"۔

اور ان کے باطن کو اللہ تعالی کے سپرد کر دیں گے۔

کیوں کہ وہی اس پر مطلع ہے، بندے نہیں ہیں اور وہ ڈھکا چھپا سب جانتا ہے، ارشاد

(۱) أخرجه البيهقي في شعب الإيمان (١٠٩٧٤).

باری تعالی ہے: ﴿قُلْ إِن تُخْفُواْ مَا فِي صُدُورِكُمْ أَوْ تُبْدُوهُ يَعْلَمْهُ اللَّهُ﴾ [آل عمران: ۲۹] "آپ فرما دیجیے تمہارے سینوں میں جو ہے اس کو چھپاؤ یا ظاہر کر دو اللہ تعالی تو بہر دو صورت جانتا ہے۔ اور اسی بات کی طرف نبی ﷺ نے اشارہ فرمایا ہے: "ہم ظاہر پر حکم لگاتے ہیں اور باطن کا ذمہ دار اللہ ہے"(۱)۔ اس باب میں یہ حدیث تو بہت مشہور ہے "کیا تم نے اس کے دل کو چیر کر دیکھا تھا؟"(۲)۔

اور نہ ہی ہم امت محمدیہ ﷺ کے کسی فرد کے اوپر تلوار اٹھانے کے قائل ہیں۔

ارشاد نبوی ﷺ: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے اس وقت تک قتال کروں جب تک وہ لا الہ الا اللہ نہ کہہ دیں جب وہ یہ کہہ دیں گے تو انہوں نے اپنا خون اور اپنا مال مجھ سے محفوظ کر لیا، ہاں مگر جب اس کی ضرورت پڑے"(۳)۔ جیسے ارتداد، قصاص اور بغاوت وغیرہ کے موقع پر۔

ائمہ مسلمین کے خلاف بغاوت کرنے کا حکم

اور ہم اپنے ائمہ اور اپنے حکام کے خلاف بغاوت کرنے کو جائز نہیں سمجھتے اگرچہ وہ ظلم ہی کیوں نہ کریں اور نہ ہی ان کو بد دعائیں دیتے ہیں اور نہ ہی ان کی طاعت سے منہ

---

(۱) لم نعثر عليه.

(۲) أخرجه مسلم (۹٦). اس حدیث کا شان ورود یہ ہے کہ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما جنگ میں ایک کافر کی طرف تلوار لیکر بڑھے تو وہ کلمہ پڑھنے لگا، لیکن آپ نے پھر بھی اس کو قتل کر دیا۔ جب آقا ﷺ کو یہ بات پتا چلی تو آپ نے ان سے اس کی بابت سوال کیا، تو انہوں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! اس نے ڈر سے کلمہ پڑھا تھا۔ اس پر آقا ﷺ نے ان سے فرمایا: "کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا"۔

(۳) أخرجه البخاري (۲۵)، ومسلم (۲۰).

پھیرتے ہیں، بلکہ ان کی طاعت کو اللہ کی ہی طاعت مانتے ہیں اور اس کو اپنے اوپر فرض سمجھتے ہیں۔

کیوں کہ عصمت، امامت کے لیے شرط نہیں ہے اس لیے اگرچہ وہ ظلم ہی کیوں نہ کرے پھر بھی منصبِ امامت سے برخاست نہیں ہو گا، اسی وجہ سے اس کے خلاف کھڑے ہونا، زمین میں فساد و سرکشی اور مسلمانوں کے درمیان فتنہ پروری میں شمار ہو گا، جیسا کہ یہ خوارج کا شعار رہا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿أَطِيعُواْ ٱللَّهَ وَأَطِيعُواْ ٱلرَّسُولَ وَأُوْلِي ٱلْأَمْرِ مِنكُمْ﴾ [نساء:۵۹] "اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور تم میں جو امر والے ہیں ان کی اطاعت کرو!"۔ اس آیت میں مطلقاً امر والوں (ائمہ وحُکام) کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اب چاہے وہ عادل ہوں یا غیر عادل، اسی طرح اس آیت سے یہ بھی دلیل ملتی ہے کہ اللہ ورسول کی اطاعت کی طرح ان (ائمہ وحکام) کی اطاعت بھی قرآن سے ثابت ہے لہٰذا وہ بھی فرض ہو گی۔ لیکن اس میں تھوڑی سی تفصیل یہ ہو گی کہ ہم پر اس وقت ان کی اطاعت واجب ہو گی جب وہ اطاعتِ الٰہی کا حکم دیں یا پھر اس چیز کی دعوت دیں جس میں کوئی دینی یا دنیاوی مصلحت ہو اور اس میں معصیت کا شائبہ نہ ہو! ارشاد نبوی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ہے: "خالق کی معصیت میں مخلوق کی کوئی اطاعت نہیں کی جائے گی"[1]۔

اور ہم ان کی بہتری اور عافیت کی دعا کریں گے۔

کیوں کہ اس دعا کی قبولیت کی بڑی امید ہے اور امام ورعایا دونوں کے لیے اس میں

---

(۱) أخرجه الشهاب في مسنده (۸۷۳)، وأحمد (۲۰۶۷۲)، والطبراني في الأوسط (٤٣٢٢).

بہتری ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس سے فتنے کی آگ بھی سرد پڑ جائے گی۔ اور عافیت کی یہ دعا ان کے دین کی عافیت کے لیے بھی ہوگی اور ان کے جسم کی عافیت کے لیے بھی ہوگی، اس لیے کہ ان کے جسم کی سلامتی سے ہی نفعِ عام وابستہ ہے، کیوں کہ اسی کے ذریعہ وہ کفر و ظلم اور فتنہ و فساد کے خلاف جہاد کر سکتے ہیں اور ان کے دین کی سلامتی سے بھی صلاح عام وابستہ ہے، کیوں کہ جب وہ خود صالح ہوں گے تو رعایا کو بھی اس کی ترغیب دلا سکتے ہیں، ورنہ لوگوں کا کیا ہے وہ تو اپنے حاکم کے ہی دین پر رہتے ہیں۔

اور ہم سنت و جماعت دونوں کی اتباع کریں گے۔

کیوں کہ **سنت:** وہ راستہ ہے دین میں جس پر چلا جاتا ہے۔ اور یہ راستہ سعادتوں کا پیش خیمہ، درجات کی بلندی کا ضامن اور عقوبات سے نجات کا باعث ہے۔

اور **جماعت** سے مراد: صحابہ کرام اور وہ لوگ ہیں جنہوں نے بھلائی میں ان کی اتباع کی۔ اور ان کی اتباع ہی عین ہدایت ہے، ان میں سے جس کسی کی بھی اتباع کروگے ہدایت پا جاؤ گے اور ان سے اختلاف عین بدعت اور سراسر گمراہی ہے۔ خود نبی ﷺ نے سنت و جماعت کی اتباع پر ابھارا ہے، ارشاد نبوی ﷺ ہے: "تم پر میری سنت اور میرے بعد خلفاے راشدین کی سنت کی اتباع واجب ہے"[۱]۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے: "جو بالشت بھر بھی جماعت کے راستے سے دور ہوا تو اس نے اسلام کا پٹکا اپنی گردن سے اتار پھینکا"[۲]۔

ہم (جماعت سے) الگ تھلگ ہونے، ان کی مخالفت کرنے اور ان کا ساتھ چھوڑنے

---

(۱) أخرجه الترمذي (٢٦٧٦)، أبو داود (٤٦٠٧)، وابن ماجه (٤٢).

(۲) أخرجه الترمذي (٢٠٢٣)، وأبو داود (٤٧٥٨).

سے بچیں گے!

ارشاد نبوی ﷺ ہے: "جو مسلمانوں کی عام جماعت سے ہٹ کر کے تنہا رہے گا وہ تنہا جہنم میں بھی جائے گا![1]"

نبی ﷺ نے ہر حال میں جماعت کی اتباع کرنے کی ترغیب دلائی ہے اور بدعات کی اتباع کرنے اور جماعت کو چھوڑنے سے منع فرمایا ہے۔ بعض صحابہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ ہمارے سامنے آئے اور ایسا وعظ فرمایا جس سے آنکھوں سے اشک بہنے لگے اور دلوں میں خوف پیدا ہو گیا اتنے میں ایک آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ! لگتا ہے کہ یہ آخری وعظ ہے، اس موقع پر آپ ہم سے کس چیز کا عہد لیں گے؟ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں تمہیں اللہ کے تقوے اور (اپنے حاکم کی بات) سننے اور اس کی اطاعت کرنے کی وصیت کرتا ہوں اگرچہ وہ کوئی حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو! کیوں کہ تم میں سے جو میرے بعد زندہ رہے گا وہ بہت زیادہ اختلاف دیکھے گا لہذا تم پر میری سنت اور میرے بعد خلفائے راشدین کی سنت کی اتباع واجب ہے، اس کو مضبوطی سے پکڑ لو اور نئی نئی چیزوں سے بچو کیوں کہ ہر نئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے"[2]۔ (بتخریج ابوداؤد و ترمذی)

هم اہل عدل و امانت سے محبت رکھیں گے اور ظلم و خیانت کرنے والوں سے بغض رکھیں گے۔

---

(۱) أخرجه الحاكم في المستدرك (٣٥٨).

(۲) أخرجه الترمذي (٢٦٧٦)، أبو داود (٤٦٠٧).

یہاں پر اہل عدل و امانت سے مراد اہل حق یعنی اہل سنت و جماعت ہیں، جو عدل کا دامن مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں اور حکام و سلاطین کی جانب سے جو ان پر حقوق واجب کیے گئے ہیں وہ ان کو برابر ادا کر رہے ہیں۔

اور اہل خیانت سے مراد حکام و سلاطین کے اوامر کی مخالفت کرنے والے ہیں اور ظلم سے مراد فساد و سرکشی اور ان پر حکام کی جانب سے جو حقوق واجب تھے ان میں خیانت کرنے والے ہیں۔

ان کی محبت اور ان کے بغض سے مراد ان کے افعال سے محبت اور ان کے افعال سے بغض ہے نہ کہ ان کی ذات سے اور چوں کہ اللہ تعالی نے عدل کا حکم دیا ہے اس لیے وہ محبوب ہو گا اور ظلم و سرکشی سے منع فرمایا ہے اس لیے وہ مبغوض ہو گا۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿إِنَّ ٱللَّهَ يَأۡمُرُ بِٱلۡعَدۡلِ وَٱلۡإِحۡسَٰنِ وَإِيتَآيِٕ ذِي ٱلۡقُرۡبَىٰ وَيَنۡهَىٰ عَنِ ٱلۡفَحۡشَآءِ وَٱلۡمُنكَرِ وَٱلۡبَغۡيِۚ يَعِظُكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَذَكَّرُونَ﴾ [نحل:۹۰] "بے شک اللہ عدل و احسان کا اور اہل قرابت پر نوازش کرنے کا حکم دیتا ہے اور برائی اور بری باتوں سے اور سرکشی سے روکتا ہے وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے شاید تم نصیحت پکڑو"۔

اور جس کا علم ہم پر مشتبہ ہو گیا اس کے بارے میں ہم کہیں گے: اللہ بہتر جانتا ہے۔

یہاں پر اس عبارت کو ذکر کرنے کی ضرورت یوں پڑی کہ مذکورہ عقائد میں سے کوئی شے اگر کسی پر مشتبہ ہو جائے جس کی وجہ سے وہ شک میں پڑ جائے، یا اس کے دل میں کوئی ایسا اعتراض آگیا جس کا فوراً دفع کرنا ممکن نہ ہو تو ان تمام صورتوں میں اس پر یہ واجب ہے کہ اس کا معاملہ اور اس کا علم اللہ کے سپرد کر دے، کیوں کہ وہ تمام اشیا کی حقیقتوں سے آگاہ ہے، آسمان و زمین میں ایک ذرہ بھی اس کے علم سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ اور ایک

انسان کو اشیا کے دقائق و حقائق کی معرفت اسی صورت میں ممکن ہے جب اللہ کی جانب سے اس پر الہام و توفیق اور تعلیم و تفہیم کے در کھل جائیں، کیوں کہ جب ملائکہ نے اپنی پاکیزہ طبیعتوں کے باوجود ان چیزوں کے علم سے اپنا دامن جھاڑ لیا جن کا علم ان کے پاس نہیں تھا، انہوں نے عرض کی: ﴿لَا عِلْمَ لَنَآ إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَآ﴾[بقرہ:۳۲]"ہمیں اتنا ہی علم ہے جتنا تو نے ہمیں سکھایا"۔ پھر بھلا بشر کیوں کر ہر چیز کے جاننے کا دعوا کر سکتا ہے جس کے ساتھ ہزاروں ایسے بکھیڑے لگے ہیں جو اسے جناب قدس میں صدق دل سے متوجہ ہونے نہیں دیتے!؟

ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَمَآ أُوتِيتُم مِّنَ ٱلْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا﴾ [اسراء:۸۵] "تمہیں بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے"۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَلَا يُحِيطُونَ بِشَىْءٍ مِّنْ عِلْمِهِۦٓ إِلَّا بِمَا شَآءَ﴾ [بقرہ:۲۵۵]"وہ اس کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر اتنا ہی جتنا وہ چاہے"۔ کیوں کہ عقل بشری بہت سی اشیا کے ادراک سے قاصر ہے لہذا جب اس پر کوئی چیز مشتبہ ہو جائے تو ایسی صورت میں اسے چاہیے کہ وہ اس کا علم اللہ کے سپرد کر دے اور کہے: اللہ بہتر جانتا ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَأُفَوِّضُ أَمْرِىٓ إِلَى ٱللَّهِ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ بَصِيرٌۢ بِٱلْعِبَادِ﴾ [غافر:۴۴]"میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں بے شک اللہ بندوں کو دیکھنے والا ہے"۔

موزوں پر مسح کرنا

اور ہم سفر و حضر دونوں حالت میں موزے پر مسح کے قائل ہیں جیسا کہ اثر

(حدیث) میں وارد ہوا ہے۔

یہاں پر یہ مسئلہ رافضیوں کی تردید میں ذکر کیا گیا ہے، کیوں کہ ان کے نزدیک موزوں پر مسح کرنا جائز نہیں ہے۔ اس مسئلہ کا تعلق اگرچہ فقہ سے ہے، لیکن چوں کہ اس کے سلسلے میں جو آثار وارد ہوئے ہیں وہ شہرت کے درجے تک پہنچے ہوئے ہیں اس لیے اس کو عقائد کے تحت ذکر کر دیا تاکہ منکرین کے انکار کا رد ہو سکے۔ امام ابوالحسن کرخی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو موزوں پر مسح کا قائل نہیں ہے مجھے اس پر کفر کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔

حج اور جہاد

حج وجہاد دونوں ہمیشہ جاری رہنے والے فرائض ہیں۔

صرف ان دونوں احکام کو خصوصیت کے ساتھ ذکر کرنے کی وجہ یہ تھی کہ چوں کہ یہ دونوں ہی انتہائی مشقت والی عبادتیں ہیں، جس میں اس مال کو صرف کرنے کی بھی ضرورت ہے، جو نفس کے نزدیک بڑا محبوب ہے، اس میں جان جانے کا بھی خوف لگا رہتا ہے اور گھربار، دوست واحباب اور ملک ووطن سب کو الوداع کہنا پڑتا ہے، جبکہ حال یہ ہے کہ انسانی نفس ہر اس چیز سے دور بھاگتا ہے جو اس پر دشوار ہو، خصوصاً جب جسمانی مشقتوں کے ساتھ ساتھ اس میں محبوب مال کو بھی خرچ کرنا پڑے! یہی وجہ ہے کہ ان دونوں کو خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا تاکہ ان پر لوگوں کو ترغیب دلائی جاسکے اور ساتھ ہی ساتھ ان کے نہ چھوڑنے پر تاکید بھی ہو جائے۔ خود اللہ تعالی نے بھی فریضہ حج کو بڑی تاکید اور زور دے کر ذکر فرمایا ہے: ﴿وَلِلَّهِ عَلَى ٱلنَّاسِ حِجُّ ٱلْبَيْتِ﴾ [آل عمران: ۹۷] "اور لوگوں پر اللہ کے لیے اس گھر کا حج کرنا فرض ہے"۔ پھر حج چھوڑنے کی خطرناکی کی

طرف اس بات سے اشارہ ملتا ہے کہ ارشاد ہوا: "ومن کفر ""اور جس نے کفر کیا" یہ نہیں فرمایا: "ومن لم یحج ""اور جس نے حج نہیں کیا"۔

تارک حج کے لیے اسی سے ملتی جلتی سرزنش کا ذکر حدیث شریف میں بھی آیا ہے، حدیث نبوی ﷺ ہے: جس کے پاس اللہ کے حرمت والے گھر تک جانے کے لیے زاد راہ اور سواری کا انتظام ہو گیا پھر بھی اس نے حج نہیں کیا تو کچھ بعید نہیں کہ وہ یہودی یا نصرانی ہو کر مرے[1]۔ (بتخریج ترمذی)

پھر مذکورہ آیتِ حج کے آخر میں ارشاد ہوا: ﴿فَإِنَّ ٱللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ ٱلْعَٰلَمِينَ﴾ [آل عمران:۹۷] "بے شک اللہ سارے جہاں سے بے نیاز ہے۔ بجائے یہ فرمانے کے "غني عنہ" وہ اس حج سے بے نیاز ہے" تاکہ اللہ تعالی کے حج سے بے نیاز ہونے پر دلیل بھی قائم ہو جائے، کیوں کہ جب وہ سارے جہان سے بے نیاز ہے تو ہمارے حج سے بھی لامحالہ بے نیاز ہو گا، کیوں کہ ہمارا حج بھی اسی عالم کا ایک جز ہے۔ اور چوں کہ یہ آیت کامل بے نیازی پر دلالت کر رہی ہے اس لیے حج کے چھوڑنے پر کمالِ ناراضگی پر بھی دلالت کرے گی۔

اور رہی جہاد پر تاکید تو اس کا ذکر تو بے شمار آیا ہے اور نفس انسانی کے لیے یہ کتنا دشوار ہے یہ تو کسی پر بھی مخفی نہیں ہے، اسی وجہ سے اس کی بھی تاکید کی ضرورت پڑی۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے: "قیامت تک جہاد ہوتا رہے گا یہاں تک کہ میری امت کے سب سے آخری لوگ دجال سے جہاد کریں گے"[2]۔

---

(۱) أخرجه االترمذي (۸۱۲).

(۲) أخرجه أبو داود (۲۵۳۲).

اور ان دونوں کو ایک ساتھ ذکر کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ان دونوں کا ذکر ایک ساتھ آیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک بار میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: یارسول اللہ جب ہم عورتیں جہاد کو سب سے افضل سمجھتی ہیں تو پھر جہاد کیوں نہیں کرتیں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سب سے افضل جہاد حج مقبول ہے [1]۔ (بتخریج بخاری)

اور یہ فریضہ مسلمانوں میں جو اولوالامر ہیں ان کے تحت رہ کر ادا کرنا ہے اب چاہے وہ نیک ہوں یا بد اور یہ فرائض قیامت کے قائم ہونے تک جاری رہیں گے ان دونوں کو کوئی بھی چیز مٹا نہیں سکتی۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ جو فرمایا کہ "اولوالامر کے تحت" اس کی وجہ یہ ہے کہ حج اور جہاد دونوں ہی کے لیے سفر کرنے کی ضرورت پڑتی ہے، ان میں لشکر ایک ساتھ جمع ہوتا ہے، قافلے ایک ساتھ اکٹھا ہوتے ہیں اور ان سبھی چیزوں میں ایک ناظم کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ اگر لوگوں میں آپس میں اختلاف پیدا ہو جائے تو سبھی معاملات کو سنبھال سکے اور دشمن اور چوروں کا قلعہ قمع کر سکے۔ لہذا اگر ان میں کوئی امیر نہیں ہوگا تو بہت سے امور میں خلل آسکتا ہے لہذا اس وقت انہیں کسی ایسے شخص کی ضرورت ہوگی جس کی طرف ان حالات میں وہ رجوع کر سکیں، سبھی اس کی بات مانیں اور وہ ان سبھی پر اپنا حکم نافذ کرے اور ایسا شخص سلطان یا اس کا نائب ہی ہو سکتا ہے، اب چاہے وہ نیک ہو یا پھر بد، اس لیے کہ امیر کے لیے عصمت شرط نہیں ہے، لہذا اگر اس کی ذات سے نفع عام ہونے کی

---

(۱) أخرجه البخاري (١٤٤٨).

امید ہو اور رعایا کے مصالح کی تنظیم کاری پر قادر ہو تو وہ امام بن سکتا ہے اگرچہ فاجر ہی کیوں نہ ہو۔ کیوں کہ اس کا یہ فجور اس کی اپنی ذات کے لیے مضر ہے دوسروں کے لیے نہیں۔

***

سمعیات

نامہ اعمال لکھنے والے اور حفاظت کرنے والے ملائکہ پر ایمان لانا

اور ہم کراما کاتبین پر ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ نے ان کو ہماری حفاظت پر مامور فرمایا ہے۔

ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ ۝ كِرَامًا كَاتِبِينَ ۝ يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ﴾ [انفطار:۱۰،۱۱،۱۲] "اور بے شک تم پر کچھ حفاظت کرنے والے مامور ہیں وہ اعمال لکھنے والے، کرامت والے ہیں، تمہارے کاموں کی انہیں خبر ہے"۔

ارشاد باری تعالی ہے:﴿مَّا يَلْفِظُ مِن قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾ [ق:۱۸] "جو بھی وہ کہتا ہے اس کے پاس ایک محافظ فرشتہ تیار بیٹھا رہتا ہے"۔

یہاں پر فطری طور پر ایک سوال ذہن میں آتا ہے کہ اللہ تعالی تو بندوں کے ہر سیاہ و سفید کو جانتا ہے، پھر بھی یہ سارے انتظام کیے، اس کے پیچھے حکمت یہ کارفرما تھی کہ وہ انہیں نیک کام کرنے کی ترغیب دلائے اور برے کاموں سے روکے، کیوں کہ حفاظت کرنے والے فرشتے جو بھی خیر و شر لکھتے ہیں ان کو وہ ان کے سامنے بروز قیامت پڑھیں گے بھی۔ ارشاد باری تعالی ہے:﴿يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَمَا عَمِلَتْ مِن سُوٓءٍ تَوَدُّ لَوْ أَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهُۥٓ أَمَدًۢا بَعِيدًا﴾ [آل عمران:۳۰] "جس دن ہر جان (والا) اپنا اچھا برا عمل اس میں حاضر پائے گا وہ یہ تمنا کرے گا کہ کاش اس کے درمیان اور اس عمل کے درمیان بہت دوری ہو جائے"۔ لہذا بندے کو جب پہلے سے ہی یہ پتا رہے گا کہ اس پر کوئی محافظ تعینات ہے جو اسے دیکھ رہا ہے اس کی حفاظت کر رہا ہے تو

وہ نیک اعمال بڑھ چڑھ کر کرے گا اور جن چیزوں سے منع کیا گیا ہے ان سے بہت دور بھاگے گا۔

اور ہم ملک الموت پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو سارے جہاں کی روح قبض کرنے پر متعین ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿قُلْ يَتَوَفَّاكُمْ مَلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ﴾ [سجدہ:۱۱] آپ فرمادیجیے کہ ملک الموت (موت کا فرشتہ) تمہاری روح قبض کرے گا جو تم پر مقرر کیا گیا ہے"۔

قبر اور اس کے احوال

اور ہم اس کے لیے قبر کے عذاب اور اس کی نعمتوں پر ایمان رکھتے ہیں جو اس کا اہل ہو اور اس بات پر بھی ہمارا ایمان ہے کہ منکر نکیر انسان سے اس کی قبر میں اس کے رب، اس کے دین اور اس کے نبی کے بارے میں سوال کریں گے جیسا کہ اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ سے اور ان کے اصحاب-رضوان اللہ علیہم اجمعین-سے خبریں وارد ہوئی ہیں اور قبر یا تو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ بنے گی یا پھر جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا۔

جو بھی نصوص سے ثابت ہو اور عقل اس کا انکار بھی نہ کر رہی ہو تو اس کو قبول کرنا اور اس پر ایمان لانا واجب ہے۔

اور ہم اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ جو عذابِ قبر کا اہل ہو جیسے فاسق اور فاجر تو قبر میں اس پر عذاب ہو گا اور جو اس کی نعمتوں کا اہل ہو جیسے نیک اور صالح تو اس کو اس میں

نعمتیں ملیں گی۔

اور ہم منکر و نکیر کے سوال پر بھی ایمان رکھتے ہیں کیوں کہ اس کے بارے میں نیک لوگوں کے ذریعہ ہم تک خبریں پہنچی ہیں۔ انہیں میں سے یہ روایت بھی ہے: عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ جب کبھی قبر پر کھڑے ہوتے تو اتنا روتے کہ ان کی داڑھی تک آنسوؤں سے بھیگ جاتی اس پر ان سے کہا گیا کہ جب آپ جنت و دوزخ کا تذکرہ کرتے ہیں اس وقت بھی اس طرح سے نہیں روتے پھر آخر کیا وجہ ہے کہ قبر کو یاد کر کے آپ اس قدر روتے ہیں تو آپ نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے: قبر آخرت کی منزلوں میں پہلی منزل ہے اگر کوئی اس میں پاس ہو گیا تو باقی بعد کی چیزیں تو آسان ہیں اور اگر اسی میں ناکام ہو گیا تو اس کے بعد کی چیزیں اس سے بھی زیادہ سخت ہیں[1]۔ (بتخریج ترمذی)

عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب تم میں کوئی شخص اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو (قبر میں) صبح و شام اس کو اس کا اصلی ٹھکانہ دکھایا جاتا ہے اگر وہ جنتی ہے تو جنت اور اگر جہنمی ہے تو جہنم، پھر اس سے کہا جاتا ہے: جس دن اللہ تعالی قیامت کے دن تمہیں اٹھائے گا تو یہی تمہارا ٹھکانہ ہو گا[2]۔ (بتخریج بخاری و مسلم)

اور اسی کا مصداق اللہ تعالی کا یہ ارشاد بھی ہے: ﴿ٱلنَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا﴾ [غافر:۴۶] "صبح و شام جہنم ان پر پیش کی جائے گی"۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ

---

(۱) أخرجه الترمذي (۲۳۰۸)، والحاكم في المستدك (۷۹۴۲).

(۲) أخرجه البخاري (۱۳۱۳)، ومسلم (۲۸۶۶).

سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ بنو نجار کے باغ میں تھے اور ہم لوگ بھی ان کے ساتھ تھے اتنے میں نبی ﷺ کی سواری اتنی بدکنے لگی لگتا تھا کہ ابھی آپ کو گرادے گی، جب دیکھا تو پتا چلا کہ وہاں پر پانچ چھ قبریں ہیں۔ آقا ﷺ نے وہاں پر موجود لوگوں سے دریافت فرمایا: ان قبر والوں کو کون جانتا ہے؟ اس پر ایک آدمی نے عرض کی: میں۔ رسول اللہ ﷺ نے پھر دوسرا سوال کیا: ان کی وفات کب ہوئی؟ اس نے جواب دیا: حالتِ شرک میں۔ اس وقت حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس امت کی بھی آزمائش ان کی قبروں میں ہوگی، اگر تم اپنے مردوں کو دفن نہ کرتے ہوتے تو میں اللہ سے یہ دعا کرتا کہ تمہارے کان عذابِ قبر سن سکیں۔ پھر آقا ﷺ نے یہ دعا فرمائی: اے اللہ! عذاب قبر سے ہم تیری پناہ چاہتے ہیں[1]۔

اور رہا منکر و نکیر کا مسئلہ تو اس سلسلے میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت منقول ہے، آپ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بندے کو جب اس کے ساتھی قبر میں رکھ کر واپس پلٹتے ہیں تو ان کے قدموں کی چاپ وہ سنتا ہے پھر اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں اور آکر اسے بٹھاتے ہیں اور اس سے پوچھتے ہیں: تم اس آدمی کے بارے میں یعنی محمد ﷺ کے بارے میں کیا کہتے تھے؟ تو جو مومن ہوگا وہ جواب دے گا: میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ اس کے بعد اسے جہنم میں ایک ٹھکانہ دکھایا جائے گا اور اس سے کہا جائے گا کہ یہ تھا تمہارا جہنم کا ٹھکانہ، لیکن اس کے بدلے اللہ تعالی نے تمہیں جنت میں ٹھکانہ عطا کیا ہے پھر وہ دونوں ٹھکانوں کو دیکھے گا اور

---

(۱) أخرجه مسلم (۲۸٦۷).

پھر اس کی قبر میں جنت کا ایک دروازہ کھل جائے گا۔ اور رہا کافر یا منافق تو وہ کہے گا: مجھے کچھ نہیں معلوم، جیسا لوگ ان کے بارے میں کہتے تھے وہی میں بھی کہہ دیتا تھا، تو اس سے کہا جائے گا: تمہیں نہیں معلوم! پھر لوہے کے گرز سے اسے ایک ضرب لگائی جائے گی جس سے وہ اتنی زور سے چیخ مارے گا کہ ثقلین یعنی جن و انس کو چھوڑ کر اس کے اطراف میں سارے لوگ اس کی اس چیخ کو سن لیں گے [1]۔ (بتخریج بخاری)

اور زیادہ صحیح یہ ہے کہ انبیا سے ان کی قبروں میں سوال نہیں ہو گا۔

قبروں سے اٹھایا جانا حق ہے

اور ہم اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ بعث ہو گا، قیامت کے روز اعمال کی جزا ملے گی، ہم سب رب کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے، حساب ہو گا، اپنا اپنا نامہ اعمال ہم سب پڑھیں گے، ثواب وعقاب دیا جائے گا اور پل صراط ومیزان قائم ہوں گے۔

اور بعثت سے مراد ہے: بروز قیامت دنیا میں اچھے برے عمل کا بدلہ دینے کے لیے جسموں کو دوبارہ زندہ کر کے انہیں اکٹھا کرنا۔ اور یہ حق ہے کیوں کہ اپنے آپ میں یہ ممکن ہے اور چوں کہ ایک سچی ذات نے اس کے واقع ہونے کی خبر بھی دی ہے لہذا اس پر ایمان لانا ہم پر واجب ہے۔

اب رہی یہ بات کہ یہ ممکن ہے: تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ابتداءً پیدا کرنا ممکن تھا تو حشر جو کہ اسی پیدا کیے کو دوبارہ دہرا دینا ہے، بدرجہ اولی ممکن ہو گا۔ اور اللہ تعالی تمام ممکنات پر قادر ہے تمام کلیات وجزئیات کی اسے خبر ہے اس لیے اجزا کے بکھر جانے کے

---

(۱) أخرجه البخاري (۱۲۷۳)، ومسلم (۲۸۷۰).

بعد ان کو جمع کرنے اور اس میں زندگی پھونکنے پر بھی قادر ہوگا، اسی کی طرف اللہ تعالیٰ کے ان ارشادات میں اشارے ملتے ہیں: ﴿وَهُوَ ٱلَّذِى يَبْدَؤُا۟ ٱلْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُۥ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ﴾ [روم:۲۷] "اور وہ جو ابتداء پیدا کرتا ہے پھر وہ اس کا اعادہ بھی کرے گا اور یہ اس پر زیادہ آسان ہے"۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿قُلْ يُحْيِيهَا ٱلَّذِىٓ أَنشَأَهَآ أَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ [یس:۷۹] "آپ فرمادیں اس کو وہی دوبارہ جِلائے گا جس نے اس کو پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا"۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿أَوَلَيْسَ ٱلَّذِى خَلَقَ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضَ بِقَٰدِرٍ عَلَىٰٓ أَن يَخْلُقَ مِثْلَهُم ۚ بَلَىٰ وَهُوَ ٱلْخَلَّٰقُ ٱلْعَلِيمُ﴾ [یس:۸۱] "جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، کیا وہ اس بات پر قادر نہیں کہ وہ انہیں کی طرح دوبارہ پیدا کر دے؟ کیوں نہیں وہ تو بہت زیادہ پیدا کرنے والا اور بڑا جاننے والا ہے۔

یہ تو ارشاد خداوندی کی روشنی میں بعثت کے امکان پر دلائل تھے، اب اس بعثت کے واقع ہونے کے بارے میں بھی ارشادات خداوندی ملاحظہ ہوں: ﴿وَنُفِخَ فِى ٱلصُّورِ فَإِذَا هُم مِّنَ ٱلْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَنسِلُونَ﴾ [یس:۵۱] "اور صور پھونک دیا گیا اتنے میں وہ اپنی قبروں سے نکل کر اپنے رب کی طرف دوڑے چلے آرہے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَنُفِخَ فِى ٱلصُّورِ فَصَعِقَ مَن فِى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَن فِى ٱلْأَرْضِ إِلَّا مَن شَآءَ ٱللَّهُ ۖ ثُمَّ نُفِخَ فِيهِ أُخْرَىٰ فَإِذَا هُمْ قِيَامٌ يَنظُرُونَ﴾ [زمر:۶۸] "اور صور پھونک دیا گیا تو آسمان و زمین میں جو بھی تھے سب مر گئے سوائے ان لوگوں کے جنہیں اللہ چاہے پھر صور پھونکا گیا تو وہ کھڑے ہو گئے اور انتظار کر رہے ہیں ان کے ساتھ کیسا معاملہ

کیا جائے گا"۔

اس سلسلے میں آیات واخبار کا انبار ہے، جس سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ ضروریات دین میں سے ہے، جس پر ایمان لانا واجب ہے۔

رہی اعمال کی جزا تو اس کے بارے میں ارشاد باری تعالی ہے: ﴿إِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ [طور:۱۶] "جو بھی تم عمل کرتے تھے اس کا تمہیں بدلہ دیا جائے گا"۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے: ﴿جَزَآءًۢ بِمَا كَانُواْ يَعْمَلُونَ﴾ [سجدہ:۱۷] "بدلہ ان کے کاموں کا"۔

اور رہی بارگاہ الہی میں حاضری تو اس بارے میں ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَعُرِضُواْ عَلَىٰ رَبِّكَ صَفًّا لَّقَدْ جِئْتُمُونَا كَمَا خَلَقْنَٰكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍۭ﴾ [کہف:۴۸] "وہ صف کی شکل میں اپنے رب کے سامنے پیش کیے جائیں گے تم ہمارے پاس اسی طرح آئے ہو جس طرح پہلی مرتبہ ہم نے تمہیں پیدا کیا تھا"۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُونَ لَا تَخْفَىٰ مِنكُمْ خَافِيَةٌ﴾ [حاقہ:۱۸] "جس دن تم اس کی بارگاہ میں پیش کیے جاؤ گے تمہارا کوئی بھی راز اس سے چھپا نہ رہ جائے گا"۔

اور رہا حساب تو اس بارے میں ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَإِن كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا ۗ وَكَفَىٰ بِنَا حَٰسِبِينَ﴾ [انبیاء:۴۷] "اور اگر رائی کے برابر بھی کچھ ہو گا تو اس کو بھی ہم اس میزان پر لے آئیں گے اور ہم حساب کرنے کے لیے کافی ہیں"۔

رہا نامہ اعمال پڑھنے کا مسئلہ تو اس بارے میں ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَنُخْرِجُ لَهُۥ

يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنشُورًا ﴿١٣﴾ اقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا﴾[اسراء:۱۳، ۱۴] "آج ہم اس کے لیے نامہ اعمال نکالیں گے جس میں وہ اپنا سارا کچا چٹھا پھیلا ہوا پائے گا، اپنا نامہ اعمال پڑھو، آج تم خود ہی اپنا حساب کرنے کے لیے کافی ہو"۔

مومن کا نامہ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اور کافر کا اس کی پیٹھ کے پیچھے سے اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ ﴿٧﴾ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا ﴿٨﴾ وَيَنقَلِبُ إِلَىٰ أَهْلِهِ مَسْرُورًا ﴿٩﴾ وَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ وَرَاءَ ظَهْرِهِ ﴿١٠﴾ فَسَوْفَ يَدْعُو ثُبُورًا﴾[انشقاق:۷-۱۱] "تو جس کا نامہ اعمال اس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا تو عنقریب اس سے آسان حساب لیا جائے گا اور وہ اپنے اہل کے پاس خوشی خوشی پلٹ کر جائے گا اور رہا وہ جس کا نامہ اعمال اس کی پیٹھ کے پیچھے سے دیا جائے گا وہ چلائے گا ہائے بربادی"۔

پل صراط کی حقیقت یہ ہے کہ وہ جہنم کے اوپری حصے پر پھیلا ہوا ایک پل نما جسم ہے جو تلوار سے بھی زیادہ تیز اور بال سے بھی زیادہ باریک ہے، اس پر سے مخلوق کا گزر ہوگا، ان میں کچھ تو ایسے گزر جائیں گے جیسے اِدھر بجلی چمکی اُدھر آنکھوں سے غائب، کچھ ہوا کی سی رفتار سے، کچھ تیز رفتار گھوڑے کی چال سے، کچھ چلتے ہوئے، کچھ چیونٹی کی سی رفتار سے رینگتے ہوئے؛ دنیا میں جیسے جس کے درجات و اعمال پل صراط پر ویسے ہی اس کی چال۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوا وَّنَذَرُ الظَّالِمِينَ فِيهَا جِثِيًّا﴾ [مریم:۷۲] "پھر ہم تقویٰ اختیار کرنے والوں کو بچالیں گے اور ظلم کرنے والوں کو اسی پر سوار چھوڑ دیں گے"۔ اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو حضرت

عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، وہ فرماتی ہیں کہ ایک دن میں جہنم کو یاد کر کے رونے لگی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے رونے کا سبب پوچھا تو میں نے کہا: مجھے جہنم یاد آگیا اس لیے میں رونے لگی، یارسول اللہ! کیا قیامت کے دن بھی آپ اپنے گھر والوں کو یاد رکھیں گے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تین جگہیں ایسی ہیں جہاں پر کوئی کسی کو یاد نہیں کرے گا: میزان کے پاس جب تک اسے یہ پتا نہ چل جائے کہ اس کا ترازو ہلکا ہوگا یا بھاری، نامہ اعمال کے اڑنے کے وقت جب تک اسے یہ علم نہ ہو جائے کہ وہ کہاں پہنچنے والا ہے اس کے داہنے ہاتھ میں یا بائیں ہاتھ میں یا پھر اس کی پیٹھ کے پیچھے، اور پل صراط کے پاس جب جہنم پر اس کو بچھا دیا جائے گا حتی کہ وہ اسے پار نہ کر لے[1]۔ (بتخریج ابو داؤد)

میزان اس ترازو کا نام ہے جس سے اعمال کی مقدار پہچانی جائے گی، ان کے اچھے برے عمل کو تولا جائے گا۔ پر اس کی شکل وصورت کیا ہوگی تو اس سلسلے میں ہم سکوت اختیار کریں گے۔[2] ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَٱلْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ ٱلْحَقُّ ۚ فَمَن ثَقُلَتْ مَوَٰزِينُهُۥ فَأُو۟لَـٰٓئِكَ هُمُ ٱلْمُفْلِحُونَ﴾ [اعراف:۸] "اس دن وزن ہونا حق ہے تو جس کے پلڑے بھاری ہو گئے وہی لوگ کامیاب ہیں"۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَنَضَعُ

---

(۱) أخرجه أبو داود (٤٧٥٥).

(۲) وزن کس چیز کا کیا جائے گا اس بارے میں مفسرین کا اختلاف ہے، جمہور مفسرین کا مذہب یہ ہے کہ جن رجسٹر میں اعمال لکھے ہوں گے ان کو تولا جائے گا۔ جبکہ بعض مفسرین کا مذہب یہ ہے کہ اعمال کو ہی تولا جائے گا، اچھے اعمال کو نورانی شکل میں بنا کر داہنے پلڑے پر رکھا جائے گا جو کہ نور کا پلڑا ہو گا اور اگر برے اعمال ہوں تو انہیں قبیح شکل میں بنا کر بائیں پلڑے پر رکھا جائے گا جو کہ ظلمت کا پلڑا ہو گا۔
(تحفۃ المرید شرح جوہرۃ التوحید)

ﵟٱلۡمَوَٰزِينَ ٱلۡقِسۡطَ لِيَوۡمِ ٱلۡقِيَٰمَةِﵞ[انبیاء:۴۷]" اور ہم بروز قیامت انصاف کے ترازو لگائیں گے "۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﵟفَأَمَّا مَن ثَقُلَتۡ مَوَٰزِينُهُۥﵞ [قارعہ:۶] " رہے وہ جن کے پلڑے بھاری ہو جائیں گے "۔

جنت و دوزخ دونوں پیدا کیے جا چکے ہیں جو فنا نہیں ہوں گے

جنت و جہنم دونوں پیدا کیے جا چکے ہیں، جو نہ تو فنا ہوں گے اور نہ ہی ختم۔

اسی طرح ان دونوں جگہ رہنے والے لوگ بھی فنا نہیں ہوں گے، ارشاد باری تعالی ہے: ﵟخَٰلِدِينَ فِيهَآ أَبَدٗاﵞ[نساء:۵۷]" وہ اس میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے "۔ اس آیت میں جنت و دوزخ دونوں جگہ رہنے والے لوگوں کے لیے ان میں ہمیشہ رہنے کی صراحت کی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ ہمیشگی فنا و زوال کے منافی ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:" اہل جنت نہ تو مریں گے، نہ بوڑھے ہوں گے، نہ ان کے کپڑے پرانے ہوں گے اور نہ کبھی ان کی جوانی ختم ہو گی"[1]۔

اور اللہ تعالی نے جنت و جہنم کو مخلوق سے پہلے ہی پیدا کر دیا تھا۔

ارشاد باری تعالی ہے: ﵟوَلَقَدۡ رَءَاهُ نَزۡلَةً أُخۡرَىٰ ۝١٣ عِندَ سِدۡرَةِ ٱلۡمُنتَهَىٰ ۝١٤ عِندَهَا جَنَّةُ ٱلۡمَأۡوَىٰٓﵞ [نجم:۱۳-۱۵] " اور اس نے اس کو دوبارہ دیکھا سدرۃ المنتہی کے پاس اس کے پاس جنت الماوی ہے "۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﵟيَٰٓـَٔادَمُ ٱسۡكُنۡ أَنتَ وَزَوۡجُكَ ٱلۡجَنَّةَﵞ [بقرہ:۳۵] اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہیں۔ اس میں

---

(۱)أخرجه الترمذي (٢٥٢٦).

معتزلہ کے اس نظریہ کی تردید ہے کہ وہ دونوں ابھی پیدا نہیں ہوئے ہیں، بلکہ قیامت کے بعد پیدا کیے جائیں گے۔

اور ان دونوں جگہوں پر بسنے والے لوگ بھی پیدا کیے، ان میں سے جسے چاہا اسے اپنے فضل سے جنت کے لیے چن لیا اور جسے چاہا اسے اپنے عدل سے جہنم میں ڈال دیا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے وہ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ ایک بچے کی وفات ہو گئی تو میں نے کہا: اس کے تو بھاگ کھل گئے یہ جنت کی چڑیوں میں سے ایک چڑیا ہے! تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کیا آپ کو نہیں معلوم کہ اللہ نے جنت و دوزخ دونوں پیدا کیے، پھر جنت کے لیے بھی اہل پیدا کیے اور جہنم کے لیے بھی، پھر فرمایا: یہ جنتی ہیں اور مجھے کوئی پرواہ نہیں اور یہ جہنمی ہیں ان سے بھی مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا[1]۔

پھر یہ کہ جنت میں داخلہ اللہ کے فضل سے ملے گا محض اپنے عمل کے سبب سے نہیں۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿سَابِقُوٓاْ إِلَىٰ مَغۡفِرَةٖ مِّن رَّبِّكُمۡ وَجَنَّةٍ عَرۡضُهَا كَعَرۡضِ ٱلسَّمَآءِ وَٱلۡأَرۡضِ أُعِدَّتۡ لِلَّذِينَ ءَامَنُواْ بِٱللَّهِ وَرُسُلِهِۦۚ ذَٰلِكَ فَضۡلُ ٱللَّهِ يُؤۡتِيهِ مَن يَشَآءُۚ﴾ [حدید:۲۱] "اپنے رب کی مغفرت پانے میں اور اس جنت کو حاصل کرنے میں سبقت لے جاؤ جس کی وسعت آسمان وزمین کی وسعت کی طرح ہے جو کہ ان لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے یہ اللہ کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے نوازتا ہے"۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: "رحمت الہی کے بغیر کوئی بھی جنت میں

(۱) أخرجه مسلم (٢٦٦٢).

داخل نہیں ہو سکتا! پوچھا گیا: یا رسول اللہ! کیا آپ بھی نہیں؟ جواب آیا: میں بھی نہیں، مگر مجھ کو اللہ نے اپنی رحمت کے جلو میں لے لیا ہے"(۱)۔ اور اس میں معتزلہ کی تردید ہے جو یہ کہتے ہیں کہ نیک عمل کرنے والوں کو جنت میں داخل کرنا اللہ پر واجب ہے۔

اور جہنم میں لوگوں کا داخلہ اس کے عدل اور انصاف کے مطابق ہی ہو گا، کیوں کہ اس نے ان کو ایمان کا مکلف بنایا تھا اور انھیں اختیار دیا تھا اور اس نے انہیں پہلے سے ہی اس بات سے آگاہ کر دیا تھا کہ اگر کوئی ایمان نہیں لاتا، فرائض وواجبات کو پس پشت ڈالتا ہے اور حرام چیزوں سے نہیں بچتا تو اسے عذاب کا سامنا کرنا ہو گا اور یہ قاعدہ تو سب کو پتا ہے کہ جس نے پہلے سے ہی خطرے سے آگاہ کر دیا ہو خطرہ آنے کے بعد اس پر کوئی ملامت نہیں کر سکتا۔ اس لیے اگر وہ کسی کو عذاب دے رہا ہے تو یہ اس کا عدل اور اس کی حکمت ہے۔

ارشاد باری تعالی ہے: ﴿قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلَىٰ شَاكِلَتِهِ﴾ [اسراء: ۸۴] "آپ فرما دیجیے کہ ہر کوئی اپنے طریقے پر عمل کرتا ہے"۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے: "قیامت تک جو ہونے والا تھا اس کو لکھ کر کے قلم سوکھ گیا"(۲)۔ [یعنی سب کچھ پہلے سے ہی تقدیر میں لکھا جا چکا ہے، اب اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی، اسی طرح ارشادِ نبوی ﷺ ہے:] "جس کے لیے جو چیز پیدا کی گئی ہے وہ اس کے لیے آسان بھی کر دی گئی ہے"(۳)۔ اس

---

(۱) أخرجه البخاري (٦٠٩٦)، ومسلم (٢٨١٨).

(۲) أخرجه الطبراني في الكبير (١١٥٦٠)، وأحمد (٢٨٠٤).

(۳) أخرجه البخاري (٤٦٦٦)، ومسلم (٢٦٤٧).

سے پہلے یہ گزر چکا ہے کہ خیر و شر اللہ کے ارادے، اس کی مشیئت اور اس کی قضا و قدر سے ہیں اور وہ دونوں بندے کے مقدر میں لکھے جا چکے ہیں۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَمَا تَشَآءُونَ إِلَّآ أَن يَشَآءَ ٱللَّهُ﴾ [انسان:۳۰] "تم کچھ نہیں چاہتے، چاہتا تو اللہ ہے"۔ اسی کی طرف نبی ﷺ نے اپنے اس فرمان میں اشارہ فرمایا ہے: "اچھی بری تقدیر اللہ ہی کی جانب سے ہے"[1]۔ اور اس باب میں حدیث جبرائیل مشہور ہی ہے اور وہ گزر بھی چکی ہے لہذا اس کے اعادے کی کوئی ضرورت نہیں۔

بندے کو کسی فعل کی استطاعت اس کے کرتے وقت ہی ملتی ہے

وہ استطاعت جو نہ ملے تو فعل وجود میں نہیں آسکتا جیسے کہ "توفیق"۔ جس کی نسبت مخلوق کی طرف کرنا ہرگز جائز نہیں ہے۔ فعل کرتے وقت ہی پائی جاتی ہے،[2] اور رہی وہ استطاعت جو تندرستی و فراوانی، قدرت اور سلامتیِ اسباب کی شکل میں ہوتی ہے وہ فعل سے پہلے پائی جاتی ہے، اور اسی استطاعت سے خطاب الٰہی منسلک ہوتا ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿لاَ يُكَلِّفُ اللهُ نَفْسًا إِلاَّ وُسْعَهَا﴾ [بقرہ:۲۸۶] "کسی بھی جان پر اللہ اتنا ہی بوجھ ڈالتا ہے جتنا وہ سہ سکے"۔

یہ بات ذہن نشیں کر لیجیے کہ استطاعت دو طرح کی ہوتی ہیں: ایک باطنی اور دوسری

---

(۱) مسند ابی حنیفہ بروایت حصکفی (۱)۔

(۲) یعنی فعل سے پہلے بندے کو فعل پر قدرت حاصل نہیں ہوتی، ہاں جب وہ کسی فعل کو انجام دینے کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ تعالی اس میں اس فعل کی قدرت پیدا فرما دیتا ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ قدرت فعل سے ملی ہوتی ہے، جس طرح انگوٹھی کی حرکت انگلی کی حرکت سے ملی ہوتی ہے۔ (شیخ عبد السلام شنار حفظہ اللہ)

ظاہری۔

رہی باطنی: تو یہ وہ استطاعت ہے جس سے کوئی فعل وجود میں آتا ہے۔ اس کو اللہ تعالی فعل کے ساتھ پیدا فرماتا ہے۔ اور یہی استطاعت اگر اطاعت کی شکل میں ہو تو اسے توفیق کہتے ہیں اور اگر معصیت کی شکل میں ہو تو اسے "خُذلان" یعنی ذلت ورسوائی کہتے ہیں، پر اس کی نسبت مخلوق کی طرف نہیں کی جاسکتی۔[1] کیوں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہوتی ہے۔ اس کو اس طرح سے سمجھیے کہ اس استطاعت کا تعلق فعل کے ساتھ ایسے ہی ہوتا ہے جیسے انگوٹھی کی حرکت کا تعلق انگلی کی حرکت سے ہوتا ہے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ بندہ ہمیشہ اللہ کی توفیق، اس کی مشیئت اور اس کی تائید کا محتاج رہے۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَمَا تَشَآءُونَ إِلَّآ أَن يَشَآءَ ٱللَّهُۚ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا﴾ [انسان:۳۰] "اور تم نہیں چاہتے چاہتا تو بس اللہ ہے بے شک اللہ بہت جاننے والا اور بڑی حکمت والا ہے"۔ کسی بھی فعل کو وجود دینے میں بندے کا مستقل دخل نہیں ہے، وہ ہر لمحہ ہر وقت اللہ کا محتاج رہتا ہے اور یہی بندگی و محتاجگی کی حقیقت ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿أَنتُمُ ٱلْفُقَرَآءُ إِلَى ٱللَّهِ﴾ [فاطر:۱۵] "تم سب اللہ کے محتاج ہو"۔ اور اس میں دراصل معتزلہ کی تردید ہے جنہوں نے یہ کہا ہے کہ یہ قدرت فعل سے پہلے پائی جاتی ہے اور بندہ اس پر قادر ہوتا ہے۔

اور رہی استطاعت ظاہرہ: تو یہ وہ قدرت ہے جو تندرستی و فراوانی، قدرت اور

---

(۱) یعنی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ بندہ اللہ تعالی کو چھوڑ کر بذاتِ خود طاعت یا پھر معصیت پر قادر ہے۔
(شیخ عبد السلام شار حفظہ اللہ)

سلامتیِ اسباب کی شکل میں ہوتی ہے۔ اور بلا شبہ یہ فعل سے پہلے پائی جاتی ہے اور مکلف بنائے جانے کا دار ومدار اسی قدرت پر ہے کیوں کہ احکام کے متعلق خطابِ الٰہی استطاعت کی اسی دوسری قسم سے منسلک ہوتا ہے، کیوں کہ اس کی پہلی قسم تو باطنی ہے، جس سے بندہ آگاہ نہیں ہو سکتا، لہٰذا جو شخص نماز وروزہ اور حج جیسی عبادات پر قادر ہو گا تو اس پر یہ سب عبادتیں استطاعت کی اسی ظاہری قسم کی وجہ سے واجب ہوں گی، اگرچہ اس کی طرف سے ان میں سے کوئی سی بھی عبادت اس وجہ سے وجود میں نہ آئے کیوں کہ اللہ تعالی نے اس کے لیے استطاعت کی پہلی قسم (توفیق) کو پیدا ہی نہیں کیا ہے، جس سے فعل کا ایجاد ہونا تھا۔

ارشاد باری تعالی ہے: ﴿لَا يُكَلِّفُ ٱللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ [بقرہ:۲۸۶] "اللہ تعالی کسی بھی جان پر اتنا ہی بوجھ ڈالتا ہے جتنا وہ برداشت کر سکے"۔ اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کو اسی حکم کا مکلف بنایا جائے گا جو اس کی وسعت میں ہو، اور اگر غور کریں گے تو پتا چلے گا کہ اس کی بنیاد بھی استطاعت ظاہری پر رکھی ہوئی ہے۔

اور اس آیت میں اشاعرہ حضرات کے اس قول کی تردید ہے کہ بندے کی استطاعت کے باہر بھی اسے کسی حکم کا مکلف بنانا (عقلاً) جائز ہے۔[1]

---

(۱) یہاں پر ان دونوں باتوں میں فرق کرنا ضروری ہے کہ جو چیز بندے کی استطاعت سے باہر ہو، اللہ تعالی نے اسے اس کا مکلف تو نہیں بنایا ہے لیکن اس کی جانب سے اس کو اس کا مکلف بنانا عقلاً ممکن ہے کہ نہیں اور اس بات میں کہ کیا حقیقت میں اللہ تعالی نے اسے ایسی چیز کا مکلف بنایا ہے؟ اختلاف پہلی والی صورت میں ہے: ماتریدی حضرات کے نزدیک یہ بات عقلاً ممکن نہیں ہے، کیوں کہ اللہ تعالی حکیم ہے اور اس کی حکمت سے پرے ہے کہ وہ انسان کو کسی ایسی بات کا مکلف بنائے جس کی استطاعت وہ نہیں رکھتا۔ اور اشاعرہ

بندوں کے افعال

اور بندوں کے افعال اللہ کے پیدا کرنے اور بندوں کے کسب کرنے سے وجود میں آتے ہیں۔

اس عبارت میں "معتزلہ" اور "جبریہ" کے قول کی تردید ہے۔

معتزلہ اس بات کے قائل ہیں کہ بندوں کے افعال خود ان کے پیدا کرنے سے وجود میں آتے ہیں نہ کہ اللہ کے پیدا کرنے سے۔

اور جبریہ اس بات کے قائل ہیں کہ ان کے افعال صرف اور صرف اللہ کے پیدا کرنے سے وجود میں آتے ہیں ان میں بندوں کے کسب و اختیار کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ (۱)

اس مسئلہ میں دونوں ہی مذہب افراط و تفریط کا شکار ہو گئے ہیں۔ جبکہ اہل سنت نے اس مسئلے میں درمیانی اور سیدھی راہ اختیار کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ بندوں کے افعال اللہ کے خلق اور بندوں کے کسب سے وجود میں آتے ہیں۔ (۲)

حضرات کے نزدیک یہ عقلاً ممکن ہے، کیوں کہ اللہ تعالی کی جانب سے جو بھی صادر ہوتا ہے حسن ہی ہوتا ہے، قبیح نہیں۔ اور رہ گئی دوسری صورت کہ کیا ایسا حقیقت میں واقع ہوا ہے، تو اس میں بالاتفاق دونوں کے نزدیک اللہ تعالی نے کسی بھی شخص کو اس بات کا مکلف نہیں بنایا ہے جس کی وہ استطاعت نہ رکھتا ہو۔

(شیخ عبد السلام شار حفظ اللہ)

(۱) یاد رہے کہ یہ اختلاف بندوں کے افعال اختیاریہ کے بارے میں ہے، ان کے افعال غیر اختیاریہ جیسے بیماری، صحت، غنا، فقر، یہ سب بالاتفاق اللہ تعالی کے پیدا کرنے سے ہیں۔

(۲) یعنی جب بندہ کسی فعل کو کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس فعل سے دو قدرتیں متعلق ہوتی ہیں ایک اللہ تعالی کی قدرت ازلی اور دوسری بندے کی قدرت فانی، لیکن بندے کے اس فعل سے اللہ تعالی کی قدرت کا تعلق

بندوں کے افعال اللہ تعالی کے پیدا کرنے سے ہیں، اس بارے میں ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَٱللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ﴾ [صافات:۹۶] "اور اللہ نے تمہیں اور تمہارے اعمال دونوں کو پیدا کیا"۔ اور اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ چوں کہ تمام ممکنات کا وجود اللہ کے پیدا کرنے سے ہی ہوتا ہے اور بندوں کے افعال انہیں جملہ ممکنات میں سے ہیں لہذا وہ بھی اس کے پیدا کرنے سے ہی وجود میں آئیں گے۔

اور رہی اس بات کی دلیل کہ بندوں کے افعال میں ان کے کسب کا بھی دخل ہوتا ہے تو اس بارے میں اللہ تعالی کے یہ ارشادات ملاحظہ ہوں: ﴿ذَٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدَاكَ﴾ [حج:۱۰] "یہ اس وجہ سے کہ تمہارے ہاتھوں ہی نے اسے آگے بھیجا۔ ارشاد باری تعالی ہے۔ ﴿فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ﴾ [شوری:۳۰] "تو تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی کی وجہ سے"۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَمَن يَكْسِبْ إِثْمًا فَإِنَّمَا يَكْسِبُهُۥ عَلَىٰ نَفْسِهِۦ﴾ [نساء:۱۱۱] "اور جو بھی گناہ کرے گا وہ اپنے ذمے پر کرے گا"۔ ارشاد باری تعالی

تکوین اور تخلیق کا تعلق ہوتا ہے اور اس فعل سے بندے کی قدرت کا تعلق ارادہ اور قصد کا تعلق ہوتا ہے، لہذا اس فعل کا خالق حقیقی اللہ تعالی ہی ہے اور اس فعل کا ارادہ کرنے والا اور اس کو اختیار کرنے والا بندہ ہے، بندے کے اسی ارادے اور اختیار کی بنا پر اسے ثواب و عقاب ملتا ہے، کیوں کہ جب اس نے خیر و شر دونوں میں سے کسی ایک راستے کا ارادہ کیا اور پھر اسے اختیار کیا تو اللہ تعالی نے اس کے اسی ارادے کے مطابق فعل پیدا کر دیا۔ اسے تو مکمل آزادی دی گئی تھی اگر وہ نہ چاہتا تو اللہ تعالی اس کے لیے فعل خیر یا پھر فعل شر پیدا بھی نہ کرتا، اس نے چاہا اسی لیے اس کی چاہت کے مطابق اسے پیدا کر دیا۔ اس لیے اللہ تعالی رحیم و عادل ہے اگر وہ کسی کو ثواب دے رہا ہے تو یہ محض اس کا فضل ہے اور اگر کسی کو عقاب دے رہا ہے تو یہ اس کا عدل ہے۔ (مستفاد از شرح الخریدۃ البہیۃ للامام الدردیر)

ہے: ﴿وَمَن يَكْسِبْ خَطِيٓـَٔةً أَوْ إِثْمًا﴾ [نساء:۱۱۲] "اور جو خطا یا گناہ کرے گا"۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَـٰكِن يُؤَاخِذُكُم بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ﴾ [بقرہ:۲۲۵]

"لیکن وہ اس پر تمہارا مواخذہ کرے گا جو تمہارے دلوں نے کیا"۔

"معتزلہ" اور "جبریہ" کی اگر مانیں تو اس سے ایک نہ ایک دلیل کا ترک لازم آئے گا، لیکن ہم اہل سنت کے اس قول میں دونوں طرح کی دلیلوں پر عمل ہو جائے گا، کوئی بھی دلیل نہیں چھوٹے گی، لہذا یہی قول سب سے اعلیٰ بھی ہو گا۔

زندوں کی دعا و صدقات سے مردوں کو نفع پہنچتا ہے

زندوں کی دعا اور ان کے صدقات سے مردوں کو نفع پہنچتا ہے۔

دعا کے سلسلے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَالَّذِينَ جَاءُو مِنۢ بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ﴾ [حشر:۱۰] "اور ان کے بعد آنے والے دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہماری اور ہمارے ان بھائیوں کی مغفرت فرما جو ہم سے پہلے ایمان لائے"۔ اللہ تعالیٰ نے اس صفت پر ان کی تعریف فرمائی ہے، اگر گزرے ہوئے لوگوں کے لیے دعا و استغفار کرنے کا کوئی فائدہ نہ ہوتا تو وہ اس تعریف کے مستحق بھی نہ ہوتے۔ اور اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ میت پر نماز جنازہ پڑھنا واجب ہے اور اس میں ثنا و دعا کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ جس کا ایک صیغہ ہے "اللھم اغفر لحینا و میتنا" "اے اللہ ہمارے زندوں کی اور ہمارے مردوں کی مغفرت فرما"۔ لہذا اگر دعا میں کوئی فائدہ نہ ہوتا تو اس عدم فائدہ کی بنا پر میت کی نماز جنازہ پڑھنا بھی واجب

نہیں ہوتا۔

اور رہا صدقہ تو اس سلسلے میں ارشاد نبوی ﷺ ہے: "اپنے مردوں کے لیے صدقہ وخیرات کیا کرو"۔ اگر صدقہ کچھ فائدہ نہ دیتا تو نبی ﷺ اس کا حکم بھی نہ دیتے۔

اور اللہ دعاؤں کو قبول فرماتا ہے۔

کیوں کہ اللہ تعالی نے دعا کرنے کا حکم دیا ہے اور اس کو قبول کرنے کا وعدہ بھی فرمایا ہے ارشاد باری تعالی ہے: ﴿ٱدۡعُونِیٓ أَسۡتَجِبۡ لَكُمۡ﴾ [غافر:۶۰] "مجھے پکارو میں تمہارا جواب دوں گا"۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿أُجِيبُ دَعۡوَةَ ٱلدَّاعِ إِذَا دَعَانِ﴾ [بقرہ:۱۸۶] "میں دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھ سے دعا کرتا ہے"۔

اور وہ ضرورتیں پوری فرماتا ہے۔

کیوں کہ کمالِ رحمت اس کا وصف ہے، ہر ممکن چیز پر وہ قادر ہے، کسی بھی چیز کو پورا کرنے میں اسے کوئی مشقت پیش نہیں آتی، اور اس سے محتاجوں کا نفع بھی وابستہ ہے لہذا ظاہر یہ ہے کہ وہ ان کو پورا فرمائے گا اور وہی تو ہے جو حاجتیں پوری فرماتا ہے اور دعاؤں کو قبول کرتا ہے۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے گزشتہ عبارت کے ذریعہ بعض معتزلہ کے اس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ دعا کی اپنی کوئی تاثیر نہیں ہوتی۔

وہ ہر چیز کا مالک ہے۔

ارشاد باری تعالی ہے: ﴿لَهُۥ مُلۡكُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِ﴾ [حدید: ۲] "آسمان وزمین میں اسی کی بادشاہی ہے"۔

پر اس کا کوئی مالک نہیں ہے۔

کیوں کہ مالک مملوک نہیں ہو سکتا۔

پلک جھپکنے بھر بھی کوئی اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

کیوں کہ اس کے علاوہ ہر شَے ممکن ہے اور ممکن اپنے وجود و بقا میں ہر گھڑی واجب کا محتاج ہوتا ہے، وہ اس سے کسی بھی پل، بے نیاز نہیں ہو سکتا، لہٰذا ہر شَے کو اس کی حاجت ہو گی، ہر چیز کو اس کی ضرورت ہو گی۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ أَنتُمُ ٱلْفُقَرَآءُ إِلَى ٱللَّهِ﴾ [فاطر:۱۵] "اے لوگو! تم سب اللہ کے محتاج ہو"۔ پس وہ ہر چیز کو قیام بخشنے والا ہے، کیوں کہ ہر چیز کا قیام اس کے قائم کرنے سے ہے اور اگر وہ مخلوق سے اپنی نگاہ عنایت اٹھالے تو ایک پل بھی وہ اپنے پیروں پر کھڑی نہ رہ سکے گی، ادھر نگاہِ عنایت ہٹی ادھر فنا ان کا مقدر بنا۔

اور جس نے پلک جھپکنے بھر بھی اللہ سے بے نیازی کا گمان رکھا وہ ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

کیوں کہ محتاجگی بندے کی وہ صفت ہے جو اس سے کبھی بھی جدا نہیں ہوتی، اور بے نیازی ربِ غنی کا وصف ہے۔ اگر بندے کو یہ گمان ہو کہ وہ اپنے رب سے بے نیاز ہے، تو اسے اپنے رب کے بارے میں بھی کچھ نہیں پتا اور اپنی حقیقت سے بھی وہ انجان ہے اور ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے رب کی صفتِ بے نیازی میں بھی اس کا شریک ہونا چاہتا ہے اس لیے لامحالہ وہ کافر ہو جائے گا۔

اور ہلاکت اس کا مقدر بنے گی۔

کیوں کہ کافر کو ہمیشہ سخت عذاب میں رہنا ہے اور اس سے بڑھ کر ہلاکت کون سی ہو

سکتی ہے!؟

غضبِ الٰہی ورضائے الٰہی کا معنی

اللہ تعالیٰ کو غصہ (غضب) بھی آتا ہے اور اسے خوشی بھی (رضا) بھی ہوتی ہے، لیکن اس کا غصہ اور خوشی مخلوق کے غصے اور خوشی کی طرح نہیں ہوتی۔

کیوں کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ کے لیے غضب و رضا دونوں صفتوں کا ذکر آیا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَغَضِبَ ٱللَّهُ عَلَيۡهِمۡ﴾ [فتح:٦] "اور اللہ کا ان پر غضب ہوا"۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿رَّضِيَ ٱللَّهُ عَنۡهُمۡ وَرَضُواْ عَنۡهُ﴾ [مائدہ:۱۱۹] "اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے"۔ ان آیات کی روشنی میں ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو رضا و غضب دونوں صفتوں سے موصوف کیا جا سکتا ہے، لیکن یہاں پر یہ خیال رکھنا نہایت ضروری ہوگا کہ مخلوق کے غضب و رضا کی طرح اس کا غضب و رضا نہیں ہے، کیوں کہ مخلوق کے غضب کا معنی ہے: ایسی حالت جس کے طاری ہونے سے چہرے کا رنگ بدل کر سرخ ہو جائے اور گردن کی نسیں پھڑک اٹھیں۔ اور رضا کا مطلب ہے: کسی امر کی وجہ سے چہرے پر ہشاشت و بشاشت طاری ہو جائے اور نفس کو سرور حاصل ہو جائے۔ اور اللہ تعالیٰ تغیر و تبدل سبھی طرح کے احوال سے پاک ہے۔

غضبِ الٰہی کا معنی ہے: گنہ گاروں سے انتقام کا ارادہ فرمانا اور ان کو سزا دینا۔ یعنی وہ ان کے ساتھ اس طرح پیش آئے گا جس طرح قہر و غضب کے وقت ایک بادشاہ اپنے ماتحت کے ساتھ پیش آتا ہے۔ یا اللہ تیرے غضب سے ہم تیری پناہ چاہتے ہیں!

رضائے الٰہی کا معنی ہے: اس کا اپنے فرماں بردار بندے کے ساتھ ثواب کا اور اپنے

گنہ گار بندے کے ساتھ عفوو در گزاری کا ارادہ فرمانا۔ یعنی وہ ان کی عزت افزائی کرے گا، ان پر انعامات کی نوازش فرمائے گا، جس طرح سے ایک بادشاہ خوشی کے وقت اپنے ماتحت کے ساتھ پیش آتا ہے۔ اے اللہ ہم تیری رضا کے طلب گار ہیں اور تیری رحمت کے جویا ہیں، ہم سے راضی ہو جا اور ہم پر اپنی رحمتیں نازل فرما![1]

رسول اللہ ﷺ کے اصحاب سے محبت کرنا

اور ہم رسول اللہ ﷺ کے اصحاب سے محبت کریں گے، لیکن ان میں سے کسی کی محبت میں افراط نہیں کریں گے اور نہ ہی ان میں سے کسی سے بھی براءت کا اظہار کریں گے، جو ان سے بغض رکھے گا یا خیر کے ساتھ ان کا ذکر نہیں کرے گا ہم بھی اس سے بغض رکھیں گے اور ہم انہیں خیر کے ساتھ ہی یاد کریں گے۔ ان کی محبت دین ہے، ایمان ہے اور نیک بختی ہے اور ان سے بغض رکھنا کفر ہے، نفاق ہے اور بد بختی ہے۔

---

(۱) اس بارے میں ایک قاعدہ ہے اس کو ذہن نشین کر لیجیے بہت کام آئے گا: وہ وصف جس کا ذکر نصوص قطعیہ میں اللہ تعالی کے لیے آیا ہو، لیکن اس کا ظاہری معنی اللہ تعالی کے لیے محال ہو تو اس کا ایک لازمی اور خارجی معنی مراد ہوتا ہے۔ اس کو مثال کے ذریعہ یوں سمجھیے کہ اللہ تعالی کا ایک وصف "رحمٰن" ہے، جس کا مطلب ہوتا ہے مہربانی اور رحمت کرنے والا، جب کہ رحمت کا ظاہری اور لغوی معنی ہے "رقۃ القلب" یعنی دل کا نرم پڑ جانا، اور اللہ تعالی اس ظاہری معنی سے پاک ہے، کیوں کہ نہ تو اس کے لیے دل ہے اور نہ ہی اس کی ذات کے لیے نرم پڑنے کا کوئی تصور کر سکتا ہے۔ تو اب اس کا ظاہری معنی اللہ تعالی کے لیے محال ہے، اس لیے اس کا لازمی اور خارجی معنی مراد ہو گا اور وہ یہ کہ ہم یہاں پر دیکھیں گے کہ جب انسان کا دل کسی کے لیے نرم پڑتا ہے تو وہ اس کے ساتھ کیا کرتا ہے؟ وہ اس پر انعام واکرام اور لطف و کرم کی بارش کرتا ہے، بس اللہ تعالی کے لیے رحمت کا یہی معنی مراد ہے کہ بندے پر اس کا انعام واکرام اور لطف و کرم کی رم جھم بارش کرنا۔ اسی قاعدے پر اللہ تعالی کے لیے غضب و رضا جیسے اوصاف کو بھی قیاس کر لیجیے۔

ان سے محبت کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اس سے راضی ہو گئے، تورات، انجیل اور قرآن کے صفحات ان کی ثنا میں رطب اللسان ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿مُّحَمَّدٌ رَّسُولُ ٱللَّهِ ۚ وَٱلَّذِينَ مَعَهُۥٓ أَشِدَّآءُ عَلَى ٱلْكُفَّارِ﴾[فتح:۲۹] "محمد اللہ کے رسول ہیں اور وہ جو ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر بڑے سخت ہیں"۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ذَٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِى ٱلتَّوْرَىٰةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِى ٱلْإِنجِيلِ﴾[فتح:۲۹] "یہ ان کی مثال ہے تورات میں اور ان کی مثال ہے انجیل میں"۔ انہوں نے دین کے اظہار کے لیے اور اعلائے کلمۃ الحق کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیا، محبتِ رسول میں اپنا ملک و وطن چھوڑ دیا، رسول اللہ ﷺ کو پناہ دی، ان کی مدد کی اور کچھ نہ سوچا، اپنے سینوں کو ان کے لیے ڈھال بنا دیا اور موت کو بھی خاطر میں نہ لائے، تو پھر ان کی محبت واجب کیوں نہ ہو۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے: "میرے اصحاب کے بارے میں احتیاط برتو! ان کو میرے بعد اپنا نشانہ نہ بنانا، جس نے ان سے محبت کی تو میری محبت میں ان سے محبت کی اور جس نے ان سے بغض رکھا اس نے میرے بغض میں ان سے بغض رکھا اور جس نے انہیں ایذا پہنچائی تو گویا اس نے مجھے ایذا پہنچائی اور جس نے مجھے ایذا پہنچائی اس کا ٹھکانہ جہنم ہے"[1]۔

اب رہی یہ بات کہ ہم ان میں سے کسی کی محبت میں افراط نہیں کریں گے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی چیز میں افراط کرنا دوسری چیز کے بغض و فساد کا موجب ہے، جیسا کہ آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ رافضیوں کا حبِ علی رضی اللہ عنہ میں افراط کرنا انہیں کہاں لے گیا؟ وہ ابو بکر صدیق، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے بغض میں جا پڑے، اس بغض سے ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں!

---

(۱) أخرجه الترمذي (۳۸۶۲).

ان رافضیوں میں سے غلو کرنے والے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں الوہیت و نبوت کا بھی دعوا کر بیٹھے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: (اے علی!) تمہارے چکر میں دو طرح کے لوگ ہلاک ہو جائیں گے: پہلے وہ جو حد سے زیادہ تم سے بغض رکھیں گے اور دوسرے وہ جو حد سے زیادہ تم سے محبت کریں گے"۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کہا ہوا سچ ثابت ہوا، کیوں کہ خوارج حد سے زیادہ ان کے بغض میں ہلاک ہو گئے جس طرح سے رافضی حد سے زیادہ ان کی محبت میں ہلاک ہو گئے۔

اور رہا ان سے براءت کا اظہار کرنا تو یہ کج قلبی اور گمراہی کی دلیل ہے، کیوں کہ ان کا راستہ سیدھا راستہ ہے اور ان کا مسلک مسلکِ حق ہے اور جو ان کی اقتدا کرے گا وہی صراطِ مستقیم پر رہے گا، ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: "میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں ان میں سے جس کی بھی اقتدا کرو گے ہدایت پا جاؤ گے"(1)۔ اس لیے ان سے براءت کا اظہار کرنا ہدایت کی نفی کرنا ہے اور یہی تو ہو بہو گمراہی ہے۔

جو بھی ان سے بغض رکھے گا ہم بھی اس سے بغض رکھیں گے کیوں کہ ان سے بغض کا مطلب ہے کہ وہ ان کے اس دین سے بھی بغض رکھتے ہیں جس کو خود اللہ تعالی پسند کرتا ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَرَضِيتُ لَكُمُ ٱلۡإِسۡلَٰمَ دِينٗا﴾ [مائدہ:۳] "اور میں نے تمہارے لیے اسلام کو دین بنانا پسند کیا"۔ اور یہ بد عقیدگی کی دلیل اور نفاق و فساد کا نتیجہ ہے۔ اس لیے جو ان سے بغض رکھے یا پھر ان کا شر کے ساتھ ذکر کرے اس سے بغض رکھنا واجب ہے۔

---

(1) مشكاة المصابيح (٦٠١٨).

اور ان کے درمیان جو آپس میں اختلافات ہوئے ان میں ہم نہیں پڑیں گے اور ان کے حال کو اجتہاد پر محمول کریں گے اور خیر کے سوا دوسرے لفظوں میں ان کا ذکر نہیں کریں گے، کیوں کہ وہ دین متین کے اصول ہیں لہذا ان پر طعن و تشنیع کرنا دین پر طعن و تشنیع کرنے کے مترادف ہے۔ ان کی محبت دین، ایمان اور نیک بختی ہے اور ان کا بغض کفر، نفاق اور بد بختی ہے۔ یہ ساری باتیں ظاہر ہیں اور ضروریات دین سے ہیں۔

نبی ﷺ کی وفات کے بعد خلافت کی ترتیب

اور ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد جو سب سے پہلے خلیفہ ہوئے وہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ہیں، (انبیائے کرام کے بعد) وہی سب سے افضل ہیں اور پوری امت پر وہی مقدم بھی ہیں، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ، پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ۔ یہ سب کے سب خلفائے راشدین اور ائمہ مہدیین (ہدایت یافتہ) ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے بعد امام برحق حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ پر شیعوں نے اس مسئلہ میں جمہور مسلمین کی مخالفت کی ہے، ان کا یہ ماننا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد امام برحق حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔

جمہور مسلمین کی دلیل یہ ہے کہ تمام مہاجرین اور انصار صحابہ کرام کا حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی امامت پر اجماع ہے جو کہ ان کی امامت کو ثابت کرنے کی سب سے قوی دلیلوں میں سے ایک ہے۔ اور اس اجماع کی بنا خود نبی ﷺ کے اس فرمان پر رکھی ہوئی ہے: "ابو بکر کو حکم دو کہ وہ نماز میں لوگوں کی امامت کریں"[1]۔ آقا ﷺ نے انہیں اپنی

---

(۱) أخرجه البخاري (٦٤٦)، ومسلم (٤٢٠).

حیات میں ہی نماز میں اپنا خلیفہ بنا دیا تھا جو کہ دین کا سب سے بڑا رکن ہے لہذا وہ ان کی حیات کے بعد بھی نماز میں ان کے خلیفہ رہیں گے۔ اور جب نماز میں خلیفہ رہیں گے تو غیر نماز میں بدرجہ اولی رہیں گے، یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے دین کے لیے آپ سے راضی تھے تو ہم اپنی دنیا کے لیے آپ سے راضی کیوں نہیں ہوں گے!؟ اور چوں کہ انبیائے کرام کے بعد آپ لوگوں میں سب سے افضل ہیں، ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: "نبیوں کے بعد کسی پر بھی سورج طلوع وغروب نہیں ہوا جو ابو بکر سے زیادہ افضل ہو"[1]۔ [اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت کے سب سے زیادہ حق دار بھی آپ ہی ہوں گے!]

اب جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت اجماع سے ثابت ہو گئی اور پھر آپ نے اپنے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے خلافت کی وصیت کی اور تمام صحابہ ان کی بیعت پر متفق بھی ہو گئے، اس طرح سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت ثابت ہو گئی اور اسی کی طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا تھا: "جو لوگ میرے بعد ہوں گے (یعنی ابو بکر و عمر) اُن کی اقتدا کرو[2]۔

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات کے بعد کسی کو بھی اپنا خلیفہ نہیں بنایا، بلکہ اس معاملے کو چھ صحابہ کرام کی مجلسِ شوری پر چھوڑ دیا، جن میں سے سب کے سب کو جنت کی بشارت دی گئی ہے، ان کے نام یہ ہیں: عثمان، علی، عبد الرحمن بن عوف، طلحہ، زبیر اور سعد

(۱) أخرجه أحمد في فضائل الصحابه (۱۳۵)، والطبراني في الأوسط (۷۳۰۶).

(۲) أخرجه الحاكم (٤٤٥١)، والترمذي ٣٨٠٥، وأحمد (٢٣٢٩٣).

بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم۔ ان میں سے پہلے حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کرلی پھر مجلس شوری میں سے باقی صحابہ نے بھی آپ کے ہاتھ پر بیعت کرلی، اس طرح سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت بھی اجماع صحابہ سے ثابت ہوگئی۔

پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہوگئے اور کسی کو بھی اپنا خلیفہ نہیں بنایا، اس کے بعد اہل شوری میں سے باقی صحابہ کرام اور ان کے علاوہ دوسرے صحابہ کرام بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر متفق ہوگئے اس طرح سے آپ کی خلافت بھی ان سب کی بیعت سے منعقد ہوگئی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ پر خلافت کا سلسلہ ختم ہوگیا، جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پاک ہے: "میرے بعد خلافت تیس سال تک رہے گی، پھر اس کی جگہ بادشاہت و حاکمیت آجائے گی، جس کے بعد حاکمانہ ظلم وجبر کی داستاں شروع ہوجائے گی"[1] نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعہ یہ علم ہوگیا تھا-جو کہ آپ کا عظیم الشان معجزہ ہے- کہ خلافت کا دور تیس برس پر ختم ہوجائے گا اور اسی طرح ہوا بھی، کیوں کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی مدت دو سال تک رہی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی مدت دس سال تک رہی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کی مدت بارہ سال تک رہی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کی مدت چھ سال تک رہی اس طرح سے پوری مدت کو یکجا کریں تو تیس برس پورے ہوجاتے ہیں۔

اور یہ سب کے سب خلفائے راشدین ہیں اور وہ ائمہ ہیں جو ہدایت کے علم بردار بن

---

(۱)أخرجه الترمذي (٢٢٢٦)، وأبو داود (٤٦٤٦).

کر چکے، نبی ﷺ کی سیرت کو اپنے لیے مشعل راہ بنایا، ان کے راستے سے ذرہ برابر بھی انحراف نہیں کیا، یہی وہ پاک ہستیاں ہیں جن کی طرف نبی ﷺ نے اپنی اس حدیث میں اشارہ فرمایا تھا: «تم پر میری سنت اور میرے بعد خلفائے راشدین مہدیین کی سنت کی پیروی کرنا ضروری ہے اس کو مضبوطی سے پکڑلو» [1]۔

وہ دسوں جن کو جنت کا مژدہ ملا

وہ دسوں جن کو رسول اللہ ﷺ نے نام لے کر جنت کی بشارت دی ہے ہم بھی ان کے لیے اس جنتی بشارت کی گواہی دیتے ہیں، جس طرح سے رسول اللہ ﷺ نے ان کے لیے دی تھی اور آپ ﷺ کی بشارت حق ہے اور اس مبارک جماعت میں ان نفوسِ قدسیہ کے نام شامل ہیں: ابو بکر، عمر، عثمان، علی، طلحہ، زبیر، سعد، سعید، عبد الرحمن بن عوف اور ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہم۔ یہ سب امت کے امین ہیں ان سب پر اللہ کی رضاو رضوان نازل ہو۔

مذکورہ عبارت کا معنی ظاہر ہے، اس لیے اس کی شرح کی کوئی ضرورت نہیں۔

اور جس نے رسول اللہ ﷺ کے اصحاب، ان کی ازواجِ مطہرات اور ان کی مقدس اولاد کے بارے میں اچھی بات کہی اور ہر طرح کی ناپاکی و گندگی سے ان کو بری جانا؛ وہ نفاق سے بری ہو گیا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ چوں کہ اللہ تعالی نے بہت ساری جگہوں پر صحابہ کرام کی تعریف بیان فرمائی ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَٱلسَّٰبِقُونَ ٱلۡأَوَّلُونَ مِنَ ٱلۡمُهَٰجِرِينَ

(۱) أخرجه ابن ماجه (٤٢).

﴿وَٱلۡأَنصَارِ﴾ [توبہ:۱۰۰] "مہاجرین و انصار میں سے سبقت لے جانے والے، پہل کرنے والے"۔ ارشاد باری تعالی ہے ﴿يَوۡمَ لَا يُخۡزِي ٱللَّهُ ٱلنَّبِيَّ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ مَعَهُۥ﴾ [تحریم:۸] "جس دن اللہ اپنے نبی کو اور ان کے ساتھ ایمان لانے والوں کو رسوا نہیں کرے گا"۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿أَشِدَّآءُ عَلَى ٱلۡكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيۡنَهُمۡۖ تَرَىٰهُمۡ رُكَّعٗا سُجَّدٗا يَبۡتَغُونَ فَضۡلٗا مِّنَ ٱللَّهِ وَرِضۡوَٰنٗا﴾ [فتح:۲۹] "وہ کفار پر بڑے سخت ہیں اور آپس میں بڑے رحم دل تم انہیں رکوع کرتے ہوئے سجدہ کرتے ہوئے دیکھتے ہو وہ اللہ کے فضل اور اس کی رضا چاہتے ہیں"۔ اس لیے ہم سب پر ان کی تعظیم کرنا واجب ہے اور جس نے ان کے بارے میں اچھی بات کہی وہ نفاق سے بری ہو گیا۔

اسی طرح نبی ﷺ کی ازواج مطہرات بھی ہم سب کے لیے قابلِ تعظیم ہیں، وہ سب مومنین کی مائیں ہیں اور انہیں خاتم النبیین ﷺ کی صحبت کی برکتیں نصیب ہوئی ہیں۔

اور اسی طرح سے ان کی پاک اور طاہر اولاد وعترت کی تعظیم و تکریم بھی واجب ہے، اللہ تعالی نے انہیں نجاست سے دور کر کے خوب خوب پاک کر دیا ہے، اس لیے ان سے محبت کرنا ایمان کی نشانی ہے اور ان سے براءت کا اظہار کرنا نفاق کی علامت ہے۔ اور ان پاک بازوں کے بارے میں کوئی بری بات کہنا اس کی کج قلبی اور بد عقیدگی کی دلیل ہے۔

علمائے سلف کے بارے میں کلمہ حق

سابقین میں سے علمائے سلف اور ان کے بعد تابعین کرام سب کے سب اہلِ خیر ہیں، ساری کی ساری روایتیں انھیں کے ذریعہ آگے بڑھیں، سارا کا سارا فقہ انھیں کے حصے میں آیا، نظر وفکر کی ساری دھاریں انھیں کی بارگاہ سے بہیں! ان سب کا ذکر خیر کے ساتھ ہی کیا جائے گا اور جس نے ان کا ذکر شر کے ساتھ کیا وہ صراط مستقیم سے بہت دور ہو گیا۔

کیوں کہ ان بزرگوں کی تعظیم حقیقت میں دین کی تعظیم ہے، اس لیے کہ یہ لوگ انبیائے کرام کے وارث ہیں، شریعت کو ہم تک یہی لوگ پہنچانے والے ہیں، اس لیے ان کی تعظیم و ثنا کرنا اور ان کے بارے میں زبانِ طنز کو روکنا ہم پر واجب ہو گا۔ لہذا جس نے ان کو برائی کے ساتھ یاد کیا، ان پر زبانِ طعن دراز کی، تو اس نے حقیقت میں دین پر زبان طنز دراز کی اور وہ رُسُلِ کرام کے راستے سے بہت دور ہو گیا اب اس سے بڑھ کر نفاق وبد بختی کی علامت اور کیا ہو گی!؟

مقام ولایت مقام نبوت سے چھوٹا ہے

اور ہم کسی بھی ولی کو کسی بھی نبی پر فضلیت نہیں دیں گے، بلکہ ہم یہ کہیں گے کہ صرف ایک نبی اولیا کی پوری جماعت پر فضیلت رکھتا ہے۔ ان سے جن کرامتوں کا صدور ہوا اور اسی طرح سے جو ثقہ راویوں کے ذریعہ سے ہم تک ان کی صحیح روایات پہنچیں ان پر ہم ایمان رکھیں گے۔

کوئی بھی ولی کبھی کسی نبی کے درجے کو نہیں پہنچ سکتا، کیوں کہ ولی نبی کا تابع ہوتا ہے اور تابع کا درجہ "متبوع" کے بعد آتا ہے۔ اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہر نبی ولی ہے

اور ہر ولی نبی نہیں ہے، اس طرح سے نبی میں نبوت و ولایت دونوں صفتیں ایک ساتھ موجود ہیں، اس لیے وہ ولی سے افضل ہو گا۔

مذکورہ عبارت میں بعض جاہل صوفیا کی تردید ہے جو ولایت کو نبوت پر ترجیح دیتے ہیں۔

اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ارشاد نبوی ﷺ ہے: اللہ کی قسم انبیا کے بعد کسی پر بھی سورج طلوع و غروب نہیں ہوا جو ابو بکر سے افضل ہو[1]۔ اور یہ حدیث اس بات کا تقاضا کر رہی ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ان تمام اولیا سے افضل ہیں جو نبی نہیں ہیں، تو جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تمام اولیا سے افضل ہیں تو انبیاے کرام بدرجہ اولی ان تمام اولیا سے افضل ہوں گے۔

اولیائے کرام کی کرامتیں حق ہیں

اولیائے کرام کی کرامتوں پر ہمارا ایمان ہے، کیوں کہ قرآن میں تخت بلقیس اور آصف بن برخیا نامی ایک ولی کا قصہ ذکر کیا گیا ہے، آپ حضرت سلیمان علیہ السلام کے اصحاب میں سے تھے، جو کہ نبی نہیں تھے۔ قرآن نے ان کی بات کو نقل کرتے ہوئے فرمایا: ﴿قَالَ ٱلَّذِى عِندَهُۥ عِلْمٌ مِّنَ ٱلْكِتَٰبِ أَنَا۠ ءَاتِيكَ بِهِۦ قَبْلَ أَن يَرْتَدَّ إِلَيْكَ طَرْفُكَ ۚ فَلَمَّا رَءَاهُ مُسْتَقِرًّا عِندَهُۥ قَالَ هَٰذَا مِن فَضْلِ رَبِّى﴾ [نمل:۴۰] "جس کے پاس کتاب کا علم تھا اس نے کہا: میں آپ کے پلک جھپکنے سے پہلے ہی اس (تختِ بلقیس) کو آپ کے سامنے لا کر حاضر کر دوں گا پھر جب انہوں نے اسے اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا تو کہا:

---

(۱) أخرجه أحمد في فضائل الصحابه (۱۳۵)، والطبراني في الأوسط (۷۳۰۶).

یہ میرے رب کے فضل سے ہے"۔ اور حضرت مریم کے ہاتھ پر کیسی کیسی خارقِ عادت چیزیں ظاہر ہوئیں! ان کے پاس گرمی میں سردی کے اور سردی میں گرمی کے پھل آنا، ان کے لیے صحرا میں کھجور کے درخت کا ظاہر ہو جانا پھر اس سے تازہ پکی ہوئی کھجوروں کا گرنا، یہ سب ان کی کرامتیں نہیں تھیں تو اور کیا تھا!؟ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ان کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ﴿كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِندَهَا رِزْقًا﴾ [آل عمران: ۳۷] "جب جب زکریا ان کی قیام گاہ میں داخل ہوتے تو ان کے پاس رزق پاتے"۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَهُزِّي إِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسَاقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا﴾ [مریم: ۲۵] "کھجور کا تنا اپنی طرف ہلاؤ تو تم پر تازی کھجوریں گریں گی"۔ اس کے علاوہ سیکڑوں آثار واخبار ہیں جو اولیاے کرام کی کرامتوں کے سلسلے میں وارد ہوئی ہیں۔

جو بھی کرامت کسی ولی کے ہاتھ پر ظاہر ہوتی ہے، وہ حقیقت میں اس کے نبی کا معجزہ ہوتی ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس ولی کو جو کرامتیں بخشیں وہ اسی نبی کی اتباع کی برکت سے بخشی ہیں۔ لہذا اس کے ہاتھ پر جو بھی کرامت ظاہر ہوگی وہ اس کے نبی کی سچائی کی دلیل ہوگی، اس لیے کرامت کبھی بھی معجزے پر کوئی ضرب نہیں لگاتی بلکہ وہ تو خود اس کی تائید کرتی ہے اور اس کا پتا دیتی ہے! بر خلاف معتزلہ کے، کیوں کہ ان کا گمان یہ ہے کہ اگر ہم ولی کے ہاتھ پر معجزے کے ظہور کو جائز مان لیں تو ولی اور نبی میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا۔

اس پر ہمارا یہ کہنا ہے کہ معجزہ ہمیشہ دعوائے نبوت کے ساتھ پایا جاتا ہے اور اگر ولی نبوت کا دعوا کر بھی دے تو وہ اسی وقت کافر ہو جائے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ ولی کو اپنی

ولایت کا علم ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے اس کا علم نہ ہو بر خلاف کسی نبی کے۔ اور ایک ولی کے لیے اس وقت اپنی کرامت کو ظاہر کرنا جائز ہے جب کسی کی ہدایت پر ترغیب مقصود ہو، محض عُجب و فخر کے لیے جائز نہیں ہے۔

قیامت کی کچھ نشانیاں

اور ہم قیامت کی اِن نشانیوں پر ایمان رکھتے ہیں کہ "دجال" نکلے گا، حضرت عیسی بن مریم علیہ السلام آسمان سے اتریں گے، سورج مغرب سے طلوع ہو گا اور "دابۃ الارض" اپنی جگہ سے باہر آئے گا۔

کیوں کہ نبی ﷺ نے ان تمام چیزوں کی خبر دی ہے اور آپ ﷺ اپنی خبر میں سچے ہیں اس لیے ان کی خبروں پر ایمان رکھنا واجب ہے اور اس سلسلے میں بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں۔

کاہن و عرّاف کا حکم

ہم کسی کاہن اور کسی عرّاف (نجومی) کی تصدیق نہیں کریں گے اور نہ ہی ایسے کسی بھی شخص کی بات مانیں گے جو قرآن و سنت اور اجماعِ امت کے خلاف کوئی دعوا کرے گا۔

اب رہا کاہن و عراف کی باتوں کی تصدیق نہ کرنے کا مسئلہ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ اُس غیب کی باتوں پر مطلع ہونے کا دعوا کرتے ہیں جس علم کو اللہ نے اپنے لیے خاص کر لیا ہے جن پر انبیائے کرام کے علاوہ کوئی دوسرا آگاہ نہیں ہو سکتا اور ان کو بھی اللہ تعالی بذریعہ وحی خبر دیتا ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِۦٓ أَحَدًا * إِلَّا

مَنِ ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ﴾ [جن:۲۶،۲۷] "وہ اپنے غیب پر کسی کو بھی مطلع نہیں کرتا، مگر جس سے راضی ہو جائے رسول میں سے"۔

اور کاہن و عرّاف رسول تو ہیں نہیں اس لیے ہم ان کی تصدیق بھی نہیں کریں گے۔ حدیثِ صحیح ہے، نبی ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: "جو کسی عرّاف یا کسی کاہن کے پاس آیا اور آکر ان کی تصدیق بھی کر دی تو اس نے محمد پر جو بھی نازل ہوا اس کو جھٹلا دیا[۱]"۔

اسی طرح اگر کوئی کتاب و سنت اور اجماعِ امت کے خلاف دعوا کرے تو ہم اس کی بات نہیں مانیں گے، اس لیے کہ یہ ساری دلیلیں شریعت کے اصول ہیں اور ان اصول کے خلاف جو بھی عقیدہ ہو گا وہ بدعت ہو گا اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

جماعت کا لزوم

اور ہم جماعت کو حق و صواب سمجھتے ہیں اور اس کی خلاف ورزی کو گمراہی و عذاب گردانتے ہیں۔

یہاں پر جماعت سے مراد وہ راستہ ہے جس پر صحابہ و تابعین اور ان کے بعد ہر زمانے کے علما و مجتہدین ہوں۔ اور یہی اجماع کا مطلب ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے: "میری امت گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی"[۲]۔ ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: "جس کو عام مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہے"[۳]۔

---

(۱) أخرجه الحاكم (١٥)، وابن ماجه (٦٣٩)، وأحمد (٩٢٧٩).

(۲) أخرجه الطبراني في المعجم الكبير (١٣٦٢٣).

(۳) أخرجه الحاكم (٤٤٦٥).

اور "خلاف ورزی" سے مراد اجماع اور علما و مجتہدین کے متفق علیہ فیصلے کی مخالفت کرنا ہے، کیوں کہ اجماع کی مخالفت گمراہی ہے اور عذاب بھی، کیوں کہ یہ دردناک عذاب کا سبب ہے۔ اللہ تعالی نے اس سے منع فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَلَا تَكُونُواْ كَٱلَّذِينَ تَفَرَّقُواْ وَٱخْتَلَفُواْ مِنۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ ٱلْبَيِّنَٰتُ﴾ [آل عمران:١٠٥] "اور ان لوگوں کی طرح مت بنو جو روشن دلیلیں آنے کے بعد بھی آپس میں بٹ گئے اور اختلاف کر بیٹھے"۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے: "بالشت برابر بھی جو شخص جماعت سے دور ہوا تو اس نے اپنی گردن سے اسلام کا پٹکا اتار پھینکا"(۱)۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے: "اللہ کا دستِ عنایت جماعت پر ہے جو تنہا رہے گا وہ تنہا ہی جہنم میں بھی جائے گا"(۲)۔

آسمان وزمین میں اللہ کا دین صرف ایک ہے اور وہ ہے دین اسلام۔

ارشاد باری تعالی ہے: ﴿إِنَّ ٱلدِّينَ عِندَ ٱللَّهِ ٱلْإِسْلَٰمُ﴾ [آل عمران:١٩] "بے شک دین اللہ کے نزدیک اسلام ہے"۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَرَضِيتُ لَكُمُ ٱلْإِسْلَٰمَ دِينًا﴾ [مائدہ:٣] "اور میں نے تمہارے لیے اسلام کو دین کے طور پر پسند کیا ہے"۔ اس لیے کہ آسمان وزمین میں جتنے بھی ملائکہ اور جن وانس ہیں وہ سب کے سب توحید، اللہ کے اسماو صفات پر ایمان لانے، انبیا کے لائے ہوئے پیغام اور مبدا و معاد کی تصدیق کرنے کے مکلف بنائے گئے ہیں اور یہ سبھی چیزیں ایک ہیں جن میں کوئی بھی مکلف اختلاف نہیں کر سکتا اور نہ ہی کسی سے اسلام کے سوا کوئی دین قبول کیا جائے گا۔ ارشاد باری تعالی ہے:

---

(١) أخرجه الترمذي (٢٠٢٣)، وأبو داود (٤٧٥٨).

(٢) أخرجه الحاكم في المستدرك (٣٥٨).

﴿وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ ٱلْإِسْلَٰمِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ﴾ [آل عمران:۸۵] "اور جو اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دین چاہے گا تو وہ اس سے قبول نہیں کیا جائے گا۔ یہ سبھی دلائل اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اصل دین صرف ایک ہے اور وہ ہے اسلام! ارشاد باری تعالی ہے: ﴿إِنَّ ٱلدِّينَ عِندَ ٱللَّهِ ٱلْإِسْلَٰمُ﴾ [آل عمران:۱۹] "بے شک دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے"۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَرَضِيتُ لَكُمُ ٱلْإِسْلَٰمَ دِينًا﴾ [مائدہ: ۳] "اور میں نے تمہارے لیے اسلام کو دین کے طور پر پسند کیا ہے"۔ اور یہ خطاب زمین و آسمان میں جو بھی مکلف ہے ہر ایک سے ہے، اس لیے ان میں سے کوئی بھی اصل دین میں اختلاف نہیں کر سکتا۔

وہ یعنی کہ دین غلو و تقصیر (کسی کو اس کے حقیقی مقام سے آگے بڑھانے، یا اس کے حقیقی مقام سے نیچے گرانے) کے درمیان میں ہے۔

یعنی وہ ان دونوں کے درمیان جو بیچ کی راہ ہے اسی پر ہے کیوں کہ ان دونوں کناروں میں سے کسی ایک جانب زیادہ بڑھنا صراط مستقیم سے ہٹ جانے کے مترادف ہے۔

اور غلو کا معنی ہے: حد سے تجاوز کر جانا اور تقصیر کا معنی ہے: جتنی حد ہے اس سے پیچھے رہ جانا۔ اور دونوں ہی مذموم ہیں کیوں کہ ایک غلام کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس حد کو تجاوز کر جائے جو اس کے مولا نے اس کے لیے قائم کی ہے اور نہ ہی اس کو یہ زیب دیتا ہے کہ اس سے پیچھے رہے! اسی طرح ہو بہو اللہ کا دین بھی ہے۔

دین "تشبیہ و تعطیل" کی درمیانی راہ کا نام ہے۔

اور وہ درمیانی راہ یہ ہے کہ ہم اس طرح سے اللہ تعالی کے لیے صفاتِ جلال و کمال کو ثابت کریں جس طرح سے ان کا ذکر قرآن و سنت میں آیا ہے، بغیر کسی تشبیہ کے جیسا کہ "اہل تشبیہ و تجسیم" کا مذہب ہے۔ ان لوگوں نے خالق کو مخلوق سے تشبیہ دے ڈالی، جب

کہ حقیقت یہ ہے کہ اس کی طرح کوئی شَے نہیں ہے! اور اسی طرح اس کے لیے ان صفات کو "تعطیل" کے بغیر مانیں گے یعنی جو صفات اس کے لیے ثابت ہیں اس کی ذات سے ان کی نفی نہیں کریں گے، جیسا کہ یہ معتزلہ کا مذہب ہے۔ حتی کہ ان لوگوں نے اس کی ذات سے حقیقت میں تمام صفات کی نفی کر دی[1]۔

اسی طرح سے یہ دین جبر و قدر کی درمیانی راہ پر ہے۔

اور یہی اہل حق کا طریقہ رہا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ بندے کے اچھے برے اعمال کے وجود میں آنے میں اللہ کی تخلیق اور بندوں کا کسب دونوں شامل ہیں۔ بر خلاف اہل جبر کے، ان کا مذہب ہے کہ بندوں کا ان کے افعال کے وجود میں آنے میں کوئی عمل دخل نہیں ہے، بلکہ وہ ان افعال کے کرنے پر مجبور کر دیے گئے ہیں۔ اور اہلِ قدر کے بر خلاف بھی، ان کا مذہب ہے کہ بندوں کے افعال خود ان کے پیدا کرنے سے ہیں، اللہ تعالی کی قدرت اور اس کی تخلیق کا ان میں کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ اللہ تعالی اس امر سے بلند و بالا ہے۔

اسی طرح سے یہ دین عذابِ الٰہی سے بے خوفی اور رحمتِ الٰہی سے نا امیدی کے درمیان کی راہ ہے۔

---

(۱) یہاں پر یہ خیال رہے کہ معتزلہ نے اللہ تعالی کی ذات سے صرف صفات ذات یعنی صفات معانی کی نفی کی ہے، جیسے: علم، قدرت، ارادہ، سمع، بصر وغیرہ، جیسا کہ اس سے پہلے گزر چکا ہے، وہ صفات معنویہ: یعنی اس کے عالم ہونے، قادر ہونے، مرید ہونے اور سمیع و بصیر ہونے کا انکار نہیں کرتے ہیں، ورنہ وہ اسلام سے نکل جاتے۔ جو صفات معانی کا انکار کرے وہ اسلام سے نہیں نکلے گا البتہ اہل سنت والجماعت سے ضرور نکل جائے گا، لیکن جو شخص صفات معنویہ کا انکار کر دے وہ اسلام سے ہی نکل جائے گا۔ ثبتنا اللہ جمیعا علی الاسلام!

کیوں کہ عقابِ الٰہی سے بے خوف ہو جانے میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں عجز کا گمان ہے اور ان نصوص کی صریح مخالفت ہے جو فُسّاق و فُجّار کے عذاب کے بارے میں وارد ہوئی ہیں۔ جیسا کہ یہ "مرجئہ" کا مذہب ہے کیوں کہ ان کا ماننا ہے کہ ایمان کے ہوتے ہوئے کوئی بھی گناہ نقصان نہیں پہنچا سکتا اور جو ایک بار ایمان لے آیا پھر وہ جہنم میں نہیں جائے گا۔

اور اسی طرح رحمتِ الٰہی سے مایوس ہو جانے میں اس بات کا گمان ہے کہ وہ گناہوں کو معاف نہیں کر سکتا اور اس میں ان نصوص کی صریح مخالفت ہے جو مومنین کے وعدہ عفو و درگزر اور ان کے لیے شفاعت و معافی کے باب میں وارد ہوئیں ہیں، جیسا کہ یہ خوارج و معتزلہ کا مذہب ہے۔ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ اعمال کے بغیر ایمان کا کوئی فائدہ نہیں، لہٰذا اگر گناہ کبیرہ کرنے والا بغیر توبہ کے مر گیا تو وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

اور دونوں ہی مذہب کتاب و سنت کے مخالف ہیں۔ اب رہی اس کے عذاب سے بے خوفی تو اس سلسلے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ ٱللَّهِ إِلَّا ٱلْقَوْمُ ٱلْخَـٰسِرُونَ﴾ [اعراف:۹۹] "گھاٹا اٹھانے والے ہی اللہ کی خفیہ تدبیر سے بے خوف ہو سکتے ہیں"۔ اور اس کی رحمت سے مایوسی کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّهُۥ لَا يَا۟يْـَٔسُ مِن رَّوْحِ ٱللَّهِ إِلَّا ٱلْقَوْمُ ٱلْكَـٰفِرُونَ﴾ [یوسف:۸۷] "کفار ہی رحمتِ الٰہی سے مایوس ہوتے ہیں"۔ اس باب میں احادیث تو بکثرت ہیں۔

خاتمہ

تو یہ (یعنی ابتدائے کتاب سے لے کر یہاں تک جو بھی ذکر کیا گیا) ہمارا دین اور ہمارا عقیدہ ہے ظاہری اعتبار سے بھی اور باطنی اعتبار سے بھی۔

کیوں کہ اب تک جو بھی ذکر کیا گیا ان پر نقلی دلائل بھی شاہد ہیں اور عقلی دلائل بھی۔ اس لیے ہم پر لازم ہے کہ ہم ان پر ظاہری وباطنی دونوں لحاظ سے ایمان رکھیں، کیوں کہ ظاہر وباطن میں مخالفت منافقین کا شیوہ رہا ہے اور یہ لوگ جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے۔

اور ہم ہر اس شخص سے براءت کا اعلان کرتے ہیں جس نے ہمارے ان ذکر کردہ عقائد کی مخالفت کی اور اللہ تعالی کی بارگاہ میں دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں ایمان پر ثابت قدم رکھے اور اسی پر ہمارا خاتمہ فرمائے، ہر طرح کی نفسانی خواہشات اور ہر قسم کی مخالف رائے سے ہماری حفاظت فرمائے اور مشبہ، معتزلہ، جہمیہ، جبریہ اور قدریہ جیسے ہر اس مذہبِ بد سے ہمیں محفوظ رکھے جنہوں نے سنت اور جماعت کی مخالفت مول لی اور گمراہی کے حلیف ہوئے، ہم ان سے براءت کا اظہار کرتے ہیں اور اس بات کا ہم اعلان کرتے ہیں کہ وہ سب ہمارے نزدیک گمراہ وبدمذہب ہیں۔

یہ جو امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہم ہر اس شخص سے براءت کا اعلان کرتے ہیں جس نے ہمارے ان ذکر کردہ عقائد کی مخالفت کی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ آپ نے اس کتاب میں اول تا آخر جو بھی ذکر فرمایا وہ سب دین کے اصول ہیں اور یہی اہلِ سنت وجماعت اور صحابہ وتابعین کا مذہب رہا ہے، جو کہ نقل سے بھی ثابت ہے اور عقل سے بھی اور یہی وہ طریقہ ہے جس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ کرام تھے لہذا ان عقائد کی

مخالفت انسان کو اس مبارک جماعت سے نکال کر نفس کے پرستاروں اور بدعت کے بہی خواہوں میں شامل کر دے گی، اس لیے ایسے لوگوں سے براءت کا اعلان کرنا بھی واجب ہو گا۔

اور اسلام پر ثابت قدمی مانگنے کی وجہ یہ ہے کہ چوں کہ ایمان پر ثابت قدمی دین و دنیا کے اہم امور میں سے ہے اور انبیا و اولیا کی یہ سنت رہی ہے اور خاتمے کا دار و مدار بھی اسی پر ہے، اس لیے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایمان پر خاتمے کی دعا مانگی تاکہ دنیا و آخرت کی کامیابی و نجات اور بلندی درجات سے مالا مال ہو سکیں۔

اور آپ نے ہر طرح کی نفسانی خواہشات سے حفاظت اس لیے طلب کی، کیوں کہ نفس کے پرستاروں نے ظاہری دلیلوں کی مخالفت کی، شریعت و عقل کے قوی براہین کو پیٹھ پیچھے چھوڑا، اور ایسے اوہام و شبہات کا سہارا لیا جو کسی بھی طرح دلیل بننے کے لائق نہ تھے، اس لیے ان چیزوں سے براءت کا اعلان کرنا واجب ہے جو عداوتِ حق کا باعث بنیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ قول آپ کی نظروں سے بھی گزرا ہو گا کہ جس وقت ایک شخص نے ان کو آکر بتایا کہ ہمارے یہاں کچھ لوگ ہیں جو قدر کو نہیں مانتے۔ تو آپ نے ان سے فرمایا: ان کو جا کر بتا دو کہ میں ان سے بری ہوں۔

پھر امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے بد مذہبوں اور مخالف آرا کی تفسیر میں فرمایا: جیسے مشبہ، جہمیہ، قدریہ، جبریہ اور ان کے علاوہ دوسرے مذاہب جیسے شیعہ کرامیہ خوارج مرجئہ وغیرہ۔

آپ نے مثال میں سب سے پہلے مشبہ کا ذکر اس لیے فرمایا کیوں کہ ان کا عقیدہ سب سے زیادہ فاسد عقیدہ ہے، اس لیے کہ وہ خالقِ قدیر کی تجسیم اور اس کی بشر کے ساتھ تشبیہ کے قائل ہیں۔ امام فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں: اہل تجسیم نے کبھی بھی اللہ تعالیٰ کی

عبادت نہیں کی، کیوں کہ وہ تو اس تصویر کی عبادت کرتے رہے جو اپنے وہم وگمان سے انہوں نے فرض کی تھی اور اللہ تعالی اس سے منزّہ وپاک ہے۔

پھر ان کے بعد دوسرے نمبر پر جہمیہ[1] کا ذکر فرمایا کیوں کہ ان کے عقائد بھی خباثت میں کچھ کم نہیں ہیں، کیوں کہ وہ اللہ خالق کی تعطیل، جنت اور اہل جنت اور جہنم اور اہل جہنم کے ختم اور فنا ہو جانے کے قائل ہیں۔

پھر قدریہ کا ذکر فرمایا، کیوں کہ وہ ذاتِ الٰہی سے حقیقی معنوں میں صفاتِ ذات وصفاتِ افعال کی نفی کے قائل ہیں۔

پھر آخر میں فرمایا: ہم ان سے براءت کا اظہار کرتے ہیں اور وہ ہمارے نزدیک گمراہ وبد مذہب ہیں کیوں کہ انہوں نے ان دلائل کی مخالفت کی جو بالکل ظاہر وباہر تھے اور ان آیات واحادیث کی مخالفت کرنے میں بھی ذرا نہ ہچکچائے جو متواتر تھیں۔

یہاں پر آکر کتاب ختم ہو جاتی ہے۔

والحمد لله رب العالمين، وصلى الله على سيدنا محمد وآله وصحبه أجمعين، والله الموفق للصواب وإليه المرجع والمآب.

تمّت ترجمته بحمد الله تعالى وتوفيقه.

بروز جمعہ ۲۴ر صفر ۱۴۴۳ھ، مطابق ۱ر اکتوبر ۲۰۲۱ء، بمقام امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ، قاہرہ، مصر[2]۔

***

---

(۱) اس فرقے کا بانی ابو محرز جہم بن صفوان ترمذی ۱۲۸ھ ت ہے۔

(۲) مترجم فقیر کو امام ابو جعفر طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے قدموں میں بیٹھ کر اس کتاب کے ترجمے کے اختتام کا شرف ملا ہے، ان کا مزار اقدس امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے قرب میں واقع ہے۔

فہرستِ مضامین

نبوات ۱۰۹

سمعیات ۲۱۱

'Aqīdah Ṭahāwiyyah

کتاب کے بارے میں

بلاشبہ کتابِ مستطاب "عقیدہ طحاویہ" حضرت امام ابوجعفر احمد بن محمد طحاوی مصری حنفی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۳۲۱ھ) کی مایہ ناز تصنیف ہے، جس میں عقائدِ اہل سنت و جماعت کا مکمل بیان ہے، اہل علم کے درمیان اس کتاب کی افادیت مُسلَّم ہے، اور مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ تقریباً تمام مدارسِ اسلامیہ میں شاملِ نصاب ہے۔

اس کتاب کی ہر زبان میں بے شمار شروحات لکھی جا چکی ہیں، انہیں میں سے ایک نہایت ہی عمدہ اور اہم عربی شرح جو حضرت علامہ شیخ اکمل الدین محمد بن محمد بابرتی حنفی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۷۸۶ھ) نے تالیف فرمائی ہے۔ اس عربی شرح کی افادیت و معنویت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے حضرت مولانا محمد اسماعیل ازہری صاحب حفظہ اللہ نے اس کا اردو زبان میں نہایت ہی سلیس اور بامحاورہ ترجمہ کیا؛ تاکہ اردو داں طبقہ بھی اس سے مستفید ہو سکے۔

بحمدہ تعالی یہ اہم اور مفید شرح پہلی بار "دار الملک فاؤنڈیشن" (بریلی، الہند) سے دَورِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق بہت عمدہ اور جدید طرزِ طباعت سے آراستہ ہو کر اس وقت آپ کے ہاتھوں کی زینت بنی ہوئی ہے۔

ناشر

Published by:

DAR Al-MALIK
Publishers & distributers

Bareilly, Uttar Pradesh, (India)
Mobile No.: +91 707 808 2017
E-mail: contact@daralmalik.com
Website: https://daralmalik.com

ISBN 978-81-956136-9-4
DM038-32
9 788195 613694